معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۲۰ر روپے فی شمارہ ۱۲ر روپے

پاکستان میں سالانہ ۳۰۰ر روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پچیس پونڈ یا چالیس ڈالر (25، 40)

بحری ڈاک نو پونڈ یا چودہ ڈالر (9، 14)

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحیٰی، شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج اسٹریچن روڈ، کراچی۔

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کی ۱۵ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع ماہ کے تیسرے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہئے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر۔ ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

جلد ۱۷۲ ماہ جمادی الثانی ۱۴۲۴ھ مطابق ماہ اگست ۲۰۰۳ء عدد ۲

فہرست مضامین

شذرات

ہم نے گزشتہ مہینے لکھا تھا کہ اس وقت بابری مسجد کا مسئلہ بڑے زور شور سے اٹھایا گیا ہے، صدر مسلم پرسنل لا بورڈ سے شنکر اچاریہ کی ملاقات، خط وکتابت اور فارمولا (جو سرے سے فارمولا کہے جانے کے قابل نہیں) سب اسی مہم کی کڑیاں ہیں اور اب یہ بالکل ڈھکا چھپا نہیں رہا کہ اس پردۂ زنگاری میں کون معشوق تھا اور کس کی سرپرستی میں شنکر اچاریہ یہ کوششیں فرما رہے تھے مگر خیر اب تو یہ قصہ ختم ہوگیا اور مسلم پرسنل لا بورڈ کی مجلس عاملہ نے بالاتفاق بہ جا طور پر اسے مسترد کردیا جس کے بعد یہ بحث بند ہوجانی چاہیے کہ ۱۶؍جون کے خط کو ۶؍جولائی تک سربستہ راز رکھ کر کیوں قوم وملک کو شش وپنج میں رکھا گیا، اسے اس کے مندرجات ہی کی بنیاد پر اسی وقت کیوں نہیں رد کردیا گیا، لیکن بعض باتوں پر اگر واقعی توجہ نہیں دی گئی تو اندیشہ ہے کہ مسلمانوں کا یہ سب سے باوقار، معتبر اور قابل اعتماد ادارہ اپنی ساکھ کھودے گا، اس لیے محض قوم وملت کے مفاد میں ہم یہ قصۂ درد سنانے کے لیے مجبور ہیں۔

لکھنؤ کے ہفت روزہ توحید میل نے اپنی ۱۵؍جولائی کی اشاعت میں لکھا ہے کہ "کہا جاتا ہے کہ شنکر اچاریہ کا نامہ لطف وکرم پا کر حضرت مولانا اتنا سرور میں آئے کہ یہ فتوی لینے پر اتارو ہوگئے کہ کیا مسلمانوں کی جان ومال وآبرو کی حفاظت کے لیے مسجد کا منتقل کیا جانا جائز ہے" معاصر نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس نے ۲۵؍جون کو حضرت مولانا کی خدمت قدسی درجت میں ایک عریضہ بھیجا تھا جس کی نقل بورڈ کے ایک نائب صدر مولانا کلب صادق اور بورڈ کے ایک ممبر ظفریاب جیلانی ایڈوکیٹ کو بھی بھیجی تھی اور کسی طرف سے اس خبر کو رد نہیں کیا گیا، راقم سے علی گڑھ میں بورڈ کے ایک فاضل ممبر نے بھی اسی طرح کا اظہار خیال فرمایا تھا، اگر یہ خیال پہلے سے تھا تو دس بارہ برس تک وقت، مال اور دل ودماغ کی قوت اس قضیے میں کیوں کھپائی گئی اور اگر اچاریہ شنکر جی کے کرم نامے کو اس میں دخل ہے تو کیا بابری مسجد کو دان یا منتقل کردینے سے واقعی مسلمانوں کا لہو مانند آب ارزاں نہیں ہوگا اور جسمانی ہی نہیں ان کے معنوی وجود اور تمام مساجد کو تحفظ مل جائے گا اور روز روز کے فتنے اور خرخشے ختم ہوجائیں گے یا

اتنے فریب کھائے ہیں دل نے کہ اب مجھے ہوتا ہے موج آب پہ دھوکا سراب کا

ابھی شنکر اچاریہ اور ان کے مکتوب یا فارمولا کا تکلیف دہ چکر ختم نہیں ہوا تھا کہ حضرت مولانا کی خدمت میں قومی اقلیتی کمیشن کے چیرمین ترلوچن سنگھ اپنے لاؤ لشکر سمیت پہنچ گئے، وہ چاہے بی جے پی کی تلاش ودریافت کا نتیجہ نہ ہوں، بی جے پی تو اقلیتی کمیشن کے تقرر ہی کے خلاف تھی لیکن ترلوچن سنگھ نے اس کے نزدیک اپنی ایسی اچھی شبیہ بنائی ہے کہ لکھنؤ کے سفر کے بعد انہیں انعام سے نوازا گیا، اس کے برعکس اقلیتوں میں ان کی شبیہ بالکل اچھی نہیں، ان سے عام شکایت یہ ہے کہ وہ اپنے دائرے سے متجاوز اور اپنا اصل کام کرنے کے بہ جائے حکومت کے مفاد میں کام کررہے ہیں، گجرات فساد اور ترشول کے تقسیم کے معاملے میں ان کا یہ رویہ کھل کر سامنے آچکا ہے، ان کے اسی رویے کی بنا پر کمیشن نے ۳؍جون ۲۰۰۳ء کو دہلی میں مدرسہ نصاب پر نظر ثانی کی غرض سے جو میٹنگ بلائی تھی، مغربی بنگال کی حکومت نے اس کا بائیکاٹ کیا تھا اور وزیر اقلیتی امور محمد سلیم نے کہا تھا کہ چیرمین کو اس طرح کی میٹنگ بلانے کا کوئی حق نہیں، تعلیم ریاستی سبجیکٹ ہے اور مدرسہ کے نصاب کا فیصلہ ریاستی حکومت یا مدرسہ بورڈ کرے گا، کمیشن اس طرح کی میٹنگ بلا کر اپنے دائرے سے تجاوز کررہا ہے اور اپنا کام نہیں کررہا ہے، غیر ضروری اور متنازعہ کام کرکے سنگھ پریوار کے ایجنڈے پر کام کررہا ہے، ہم اس کی مخالفت کرتے ہیں، میں نے ریاستی وزیر پرائمری سکنڈری تعلیم کانتی بسواس سے اس سلسلے میں بات کی ہے اور فیصلہ یہ کیا گیا کہ ریاستی حکومت کا کوئی نمائندہ کمیشن کی ۳؍جون کی میٹنگ میں شرکت نہیں کرے گا۔

اب ترلوچن سنگھ لکھنؤ آئے تو سماج وادی پارٹی کے کونسل میں اپوزیشن لیڈر احمد حسن نے کہا کہ وہ اپنے اصل مقاصد سے ہٹ کر نہ صرف بھاجپا سیل کے طور پر حکومت کا کام کررہے ہیں بلکہ کمیشن نے راج دھانی کا جو دورہ کیا اس میں بھی غلط بیانی کرکے اترپردیش حکومت کو بچانے کا کام کیا ہے، اقلیتی کمیشن اور مسلمانوں کی نمائندگی کے نام پر جو نصف درجن مسلم لیڈران خفیہ سازش کرکے اجودھیا معاملے میں سودے بازی کا کام کررہے ہیں ان کی پارٹی ایسے لوگوں کو جلد ہی بے نقاب کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے کالے کارناموں کا دستاویز بھی عوام کے سامنے پیش کرے گی، اترپردیش مسلم مجلس کے دو لیڈروں نے ان کی آمد کو مسلمانوں خصوصاً مدارس کے لیے نامبارک قرار دیتے ہوئے یہ کہا کہ وہ اترپردیش کی راج دھانی میں خود نہیں آئے تھے بلکہ وزیر اعظم اور نایب وزیر اعظم نے اس لیے بھیجا تھا کہ آیا اب بھی مسلم پرسنل لا بورڈ بابری مسجد کے معاملے

پر بات چیت کر سکتا ہے، دوسرا مقصد مایاوتی حکومت کو بچانا تھا جس کا انہیں فوراً انعام بھی مل گیا، اگر چہ بورڈ کے صدر اور کمیشن کے چیرمین نے ملاقات کا اصل مقصد کچھ اور بتایا مگر صدر صاحب کو بھی اعتراف ہے کہ "بات چیت میں اجودھیا کے سوال پر کوئی سنجیدہ بات نہیں ہوئی" اور خود چیرمین نے کہا کہ اگر چہ قومی اقلیتی کمیشن کا تعلق مسئلہ اجودھیا سے نہیں ہے مگر دونوں فریقوں کے درمیان مزید بات چیت کے لیے موافق فضا بنانے کی ہماری کوشش جاری رہنی چاہیے، مذہبی رہنماؤں کے مذاکرات کے ذریعہ اجودھیا تنازعہ کو حل کرنے کا ذکر بھی آیا، یہ حضرات از خود تشریف لائے تھے مگر جانے کے بعد واقعہ تحکیم کی صورت پیدا ہوگئی ہے، میڈیا کی کارستانیاں الگ، شیخ محمد بن زید النہیان اور مراکشی اسکالر حسن عمرانی کے تعلق سے بھی اخباروں میں باتیں آئی تھیں، عرض یہ کرنا ہے کہ اجودھیا جیسے نازک اور حساس معاملے میں ادنی بے احتیاطی، کچھ سے کچھ ہو جاتی اور بنا دی جاتی ہے، رہے مسلمان تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ع ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی۔

اس وقت بی۔ جے۔ پی کے لیڈر اجودھیا کے معاملے میں عدالتی فیصلے کو غیر موثر اور غیر اطمینان بخش قرار دیتے ہوئے مذاکرات پر زیادہ زور دے رہے ہیں، ان کے خیال میں عدالتی فیصلے سے فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور پر امن حل نہیں نکل سکتا، مذاکراتی تصفیہ ہی مسئلے کا بہترین حل ہے جس سے تنازعہ پر کشیدگی دور کرنے میں مدد ملے گی، وہ خوش ہیں کہ متعدد مسلم افراد اور تنظیمیں اجودھیا کے مسئلے کے حل کے تعلق سے باتیں کرنے لگی ہیں، حالاں کہ سب کو معلوم ہے کہ مذاکرات سے مسئلہ طے ہونے کے بہ جائے مزید الجھ جائے گا، سنگھ پریوار بل پیش کرنے، رام مندر کی تعمیر کے لیے قانون بنانے یا وزیر اعظم سے استعفا کا جو مطالبہ کر رہا ہے وہ خود اور بی جے پی بھی جانتی ہے کہ یہ سب فی الحال ہونے والا نہیں، یہ مسئلے کو گرم رکھنے اور الکشن میں بی جے پی کو کامیاب بنانے کا ایک بہانہ ہے، یہ بات بھی قابل غور ہے کہ مذاکرات کی یہ رٹ خود مسلمانوں میں اختلاف اور دوری پیدا کرنے کے لیے لگائی جارہی ہے، ایمرجنسی میں جیل سے رہائی کے بعد جماعت اسلامی ہندان سے پینگ بڑھانے کا تجربہ اور مسلمانوں کے عتاب کا نشانہ بن چکی ہے، کیا مذاکرات کے نام پر اسی غلطی کا اعادہ کیا جارہا ہے، گفت و شنید، مفاہمت اور غیر مسلموں سے دوستی اور لطف و مدارات بہت اچھی چیز ہے مگر ان کی سازشوں کا شکار ہو جانا اور بابری مسجد منہدم کرنے والوں کو اب اسے ہڑپ بھی کر جانے کا موقع دینا یا اس میں ان کا معاون بن جانا دوسری چیز ہے۔

سورۂ تکویر کے اسرار و عجائب

از مولانا محمد شہاب الدین ندوی مرحوم☆

(۲)

۳۔ دعوت اسلامی سائنٹفک طریقے سے

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطَانٍ رَّجِيمٍ فَأَيْنَ تَذْهَبُونَ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ لِمَنْ شَاءَ مِنْكُمْ أَنْ يَسْتَقِيمَ وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ

(آیات: ۱۵۔۲۹)

یہ کسی شیطان مردود کا کلام نہیں ہے، لہذا تم کدھر جارہے ہو؟ یہ تو سارے جہاں کے لیے ایک تذکرہ ہے، لہذا تم میں سے جو چاہے وہ سیدھا ہو جائے مگر تم نہیں چاہو گے، جب تک کہ اللہ نہ چاہے، جو سارے جہاں کا رب ہے۔

پہلے مضمون میں قیامت اور دوسرے مضمون میں قرآن اور رسالت محمدیؐ کا اثبات کرنے اور اس سلسلے میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کو علمی انداز میں دور کرنے کے بعد اب تیسرے مضمون میں عالم انسانی کو بالکل عقلی و منطقی انداز میں دعوت دی جارہی ہے کہ جب خدا کا وجود علم و تحقیق کی روشنی میں ثابت ہو گیا اور قرآن اور رسالت نیز قیامت کی حقانیت بھی دلایل کی روشنی میں واضح ہو گئی کہ یہ سب کوئی داستان پارینہ یا دقیانوسیت نہیں، بلکہ سائنسی تحقیقات کی روشنی میں ایک اٹل اور ناقابل تردید صداقت ہے، لہذا اب ہر ایک کو اختیار ہے کہ وہ ان حقایق کو بغیر کسی جبر واکراہ کے اپنی مرضی سے تسلیم کرے اور خلاق عالم کو (جو اس کائنات کی ایک ایک چیز سے بہ خوبی واقف ہے) اپنا رب اور معبود مان لے، ورنہ بصورت دیگر اسے اپنے انجام بد کے لیے تیار رہنا چاہیے، یہ ایک خالص سائنٹفک طریقۂ دعوت ہے، جس کا داعی و علم بردار آج روئے زمین پر صرف

☆ بانی فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ بنگلور ۲۶۔

اسلام جیسا دین فطرت ہی ہے اور یہ اسلوبِ دعوت موجودہ سائنسی مزاج رکھنے والوں کے لیے حد درجہ مؤثر ہے اور خاص کر مادیت کے مارے ہوئے لوگوں کے لیے ایک تریاق سے کم نہیں ہے اور دعوت کا یہ اسلوب بہ جائے خود ایک معجزہ ہے جو اس بات کی مزید ایک دلیل ہے کہ یہ معجزہ نما کلام ہر دور کے مزاج کے مطابق نوع انسانی کو مخاطب کر سکتا ہے ''یہ کسی شیطان مردود کا کلام نہیں ہے، تم کدھر بہکے جا رہے ہو؟'' (آیات: ۲۵-۲۶)۔

چنانچہ دور رسالت میں کفار و مشرکین قرآن مجید کو کلام الٰہی ماننے کے بہ جائے اس پر طرح طرح کی پھبتیاں کستے تھے، بالکل اسی طرح موجودہ دور میں بھی منکرینِ خدا اسے اللہ کا کلام تسلیم کرنے کے بہ جائے کبھی تو کہتے ہیں کہ یہ محمد ﷺ کا گھڑا ہوا ہے تو کبھی کہتے ہیں کہ یہ تورات اور انجیل وغیرہ قدیم صحیفوں کا چربہ ہے، جیسا کہ اس سلسلے میں بہت سے مستشرقین کا خیال ہے، مگر صاف ظاہر ہے کہ یہ ایسا بلند پایہ کلام ہے جو اپنے غیبی اور ابدی حقایق و معارف کی بنا پر نہ تو کسی انسان کا تصنیف کردہ ہو سکتا ہے اور نہ تورات و انجیل سے ماخوذ، کیوں کہ یہ تمام قدیم صحیفے اس قسم کے کائناتی حقایق و معارف سے یکسر خالی ہیں، لہذا یہ کلام اس اعتبار سے بھی ایک معجزہ نظر آتا ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔

''یہ قرآن سارے جہاں کے لیے ایک تذکرہ و تنبیہ ہے، تو اب تم میں سے جو چاہے وہ سیدھا ہو جائے'' (آیات: ۲۷-۲۸)۔

یعنی ان غیبی حقایق کے منکشف ہو جانے کے بعد اب ہر ایک کو اختیار ہے کہ وہ اس کلامِ برتر کو برحق تسلیم کرتے ہوئے اس پر ایمان لائے یا ابدی لعنتوں کا مستحق بن جائے، اس طرح یہ کتاب حکمت دل کے دروازوں پر دستک دیتی اور ذہنی دریچوں کو کھولتی ہے، تاکہ جس کے دل میں طلب حق کی کوئی رمق بھی باقی ہو وہ اس دعوت حق کو ایک غیبی آواز تصور کرتے ہوئے اس ندائے ربانی پر لبیک کہہ سکے، ظاہر ہے کہ یہ ایک فطری و عقلی طریقۂ دعوت ہے جو انسان کو حق شناسی پر ابھارتے ہوئے اس کے ضمیر کو جھنجوڑتا ہے، اس اعتبار سے عصر جدید میں اس طریقۂ دعوت کی بہت بڑی اہمیت ہے اور یہ طریقہ وہی اختیار کر سکتا ہے جس نے نہ صرف انسان کو پیدا کیا بلکہ اس کے ''عقلی مزاج'' سے بھی بہ خوبی واقف ہے، ورنہ کلام الٰہی اور انسان کے عقلی مزاج میں اس

قدر موافقت نہ پائی جاتی، قرآن عظیم اس اعتبار سے بھی ایک معجزہ ہے، لہذا اس کے ان ابدی حقایق کا انکار نوع انسانی کے لیے بڑی محرومی کی بات ہے، انسان کو چاہیے کہ وہ خیر اور شر اور اچھے برے میں تمیز کرتے ہوئے اس صدائے حق پر کان دھرے، جو اس کے لیے حیاتِ جاودانی کا باعث ہے، ورنہ بہ صورت دیگر وہ اپنا ہی نقصان کرے گا اور روزِ جزا کے دن اس کا کوئی بھی عذر کام نہ آئے گا، یہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے، وہ یہاں جو بوئے گا کل وہی کاٹے گا، لہذا غافل انسان کو فوراً سنبھل جانا چاہیے۔

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ

اور تم نہیں چاہو گے جب تک کہ اللہ نہ چاہے، جو اس کائنات کا رب ہے۔

انسان مختار ہے یا مجبور؟

پچھلی آیت میں خدائے تعالیٰ نے بندوں کی مشیئت ثابت کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ تم میں سے جو چاہے وہ سیدھا ہو جائے، مگر اس کے فوراً بعد کہا جا رہا ہے کہ تمہاری مشیئت یا تمہارا ارادہ و اختیار اللہ کی مشیئت کے تابع ہے، یعنی تم اپنے ارادے و اختیار میں آزاد نہیں ہو، بہ ظاہر ان دونوں آیتوں میں تضاد پایا جا رہا ہے، لہذا اس مسئلے کا حل کیا ہے؟ دراصل یہ تقدیرِ الٰہی کا مسئلہ ہے جو ہر دور میں عقلا اور دانش وروں کے لیے باعثِ حیرانی رہا ہے، صحیح بات یہ ہے کہ بندہ اپنے ارادے و اختیار میں نہ تو پوری طرح آزاد ہے اور نہ پوری طرح مجبور، بلکہ وہ ایک حیثیت سے آزاد ہے تو دوسری حیثیت سے مجبور۔

تقدیر الٰہی ایک مشکل ترین مسئلہ ضرور ہے مگر وہ کوئی معمہ نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کا مقدر ضرور متعین کر دیا ہے مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی فیصلہ کر دیا ہے کہ ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے، یعنی جو شخص نیکی کا راستہ اختیار کرے گا وہ اپنی ہر مرضی سے کرے گا، لیکن چوں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق اور اس کی تقدیر بنانے والا ہے اس لیے وہ ہر شخص کے انجام سے بہ خوبی واقف ہے کہ فلاں بندہ ایسا ایسا ضرور کرے گا، لہذا انسان کی عافیت اسی میں ہے کہ وہ نیکی اور ہدایت کا راستہ اپناتے ہوئے گمراہی کے راستے سے بچنے کی کوشش کرے، کیوں کہ اللہ نے انسان کو عقل و شعور، سوجھ بوجھ اور قوتِ فیصلہ سے نوازا ہے اور اسے اچھے اور برے میں تمیز کرنے کی قوت و صلاحیت بھی عطا کی ہے، چنانچہ وہ اپنی اس قوت سے کام لیتے ہوئے اپنی زندگی میں

ایسا کوئی کام نہیں کرتا جو اسے نقصان پہنچانے والا ہو، مثال کے طور پر وہ آگ میں ہاتھ نہیں ڈالے گا، کانٹوں پر پیر نہیں رکھے گا اور جان بوجھ کر زہر نہیں پیے گا، کیوں کہ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ سب چیزیں اس کے لیے نقصان دہ ہیں، اسی طرح انسان کے سامنے خیر و شر کا راستہ بھی رکھ دیا گیا ہے کہ وہ اپنی عقل و شعور کو استعمال کرتے ہوئے ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرے اور یہ بندوں کے لیے ایک امتحان ہے، تقدیر کا مسئلہ اپنی جگہ ضرور ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ بندہ جو کچھ کرتا ہے وہ اپنے ارادہ و اختیار کی بنا پر کرتا ہے اور اس پر کوئی جبر نہیں ہے، اب اگر کوئی شخص تقدیر کا بہانہ کر کے گمراہی کا راستہ اختیار کرے گا تو اللہ اس کے لیے اسی میں آسانی پیدا کردے گا، اس کے برعکس جو شخص ہدایت کا راستہ اپنائے گا تو اللہ اس کے لیے اس میں آسانی پیدا کردے گا جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ "عمل کرو ہر شخص کو اسی میں آسانی دی جائے گی جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے" (اِعْمَلُوْا کُلٌّ مُیَسَّرٌ) (۱) جب کہ بعض حدیثوں میں "کُلٌّ مُیَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَہٗ" بھی مذکور ہے۔

تقدیر الٰہی کیا ہے؟ مگر آسانی ان ہی خوش قسمت لوگوں کو نصیب ہوگی جو خدائی دلائل اور اس کی ہدایت سے متاثر ہوکر ہدایت کا ارادہ بھی کریں، یہی ان کی تقدیر ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے مقدر کردی ہے لہذا ہر شخص کو ہدایت یافتہ بننے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے، ورنہ اگر وہ تقدیر الٰہی کا بہانہ کر کے "جبریت پسند" بن جائے یعنی اپنے آپ کو مجبور ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے برائی کا ہی راستہ منتخب کرلے تو ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ زبردستی ہدایت سے نہیں نوازتا، حالاں کہ اسے اس بات کی قدرت ضرور حاصل ہے کہ اگر وہ چاہے تو تمام انسانوں کو ہدایت یافتہ بنادے، مگر اس کی تقدیر یہی ہے کہ اس نے بندوں کو آزمانے کی غرض سے یہ ضابطہ بنادیا ہے کہ ہر شخص اپنے لیے خود دونوں راستوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرے، اس اعتبار سے اللہ تعالیٰ پر کسی کو گمراہ کرنے کا الزام عائد نہیں ہوتا، واللہ اعلم بالصواب۔

اس موقع پر چوں کہ بندوں کا اختیار (مشیت) اور اللہ کا اختیار دونوں کا بہ یک وقت اثبات ہورہا ہے، لہذا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بندوں کو بھی ارادہ و اختیار (بہت بڑی حد تک) ضرور حاصل ہے، جیسا کہ بعض دیگر مقامات میں مذکور آیات سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، مثلاً۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (کہف: ۲۹)

کہہ دو کہ حق بات تمہارے رب کی جانب سے ہے، تو اب جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے انکار کرے (تم پر کوئی زبردستی نہیں ہے)۔

اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (مزمل: ۱۹)

یہ ایک یاددہانی ہے، لہذا جو چاہے وہ اپنے رب کا راستہ اختیار کرے۔

باری تعالیٰ مختار کل اس اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بندہ ایک حیثیت سے مختار ہے تو دوسری حیثیت سے مجبور ہے، جہاں تک اس کے عمل و ارادے کا تعلق ہے تو وہ مختار ہے اور جہاں تک اللہ تعالیٰ کی قدرت و ربوبیت کا تعلق ہے تو وہ مجبور محض ہے، یعنی خلاق عالم نے طبیعی و حیاتیاتی نقطۂ نظر سے جو ضوابط اس کے لیے مقرر کردیے ہیں انہیں وہ توڑ نہیں سکتا اور جو چاہے وہ کر نہیں سکتا، چنانچہ زیر بحث آیت میں "رب العالمین" کے جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں ان کی رو سے بطور اشارہ یہ مفہوم بھی نکل سکتا ہے، یعنی باری تعالیٰ کی ربوبیت چوں کہ ہمہ گیر اور سارے جہاں پر محیط ہے اس لیے وہ جس طرح چاہتا ہے ان کے ضوابط مقرر کرتا ہے اور جو چاہتا ہے وہ پیدا کرتا ہے، اس کے قوانین ربوبیت کو کوئی مخلوق توڑ نہیں سکتی اور جو چاہے وہ کر نہیں سکتی، جیسے رزق رسانی کا نظام، بارش کا نظام، بادلوں کا نظام، زمین سے اناج اگانے کا نظام، مخلوق پروری کے لیے خورد و نوش کا نظام اور ماں کے پیٹ سے جنین کی تخلیق وغیرہ وغیرہ، چنانچہ ان تمام نظاموں میں باری تعالیٰ پوری طرح مختار کل ہے اور کوئی بھی مخلوق ان نظاموں میں اس کا ساجھی یا شریک نہیں ہے۔

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (قصص: ۶۸)

اور تیرا رب جو چاہتا ہے وہ پیدا کرتا ہے اور جو چاہے وہ اختیار کرتا ہے، ان کو کوئی اختیار نہیں، اللہ ان کے شرک سے پاک اور برتر ہے۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (مائدہ: ۱۷)

آسمانوں، زمین اور ان دونوں کے درمیان موجود چیزوں کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے، وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

هُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُکُمْ فِی الْاَرْحَامِ کَیْفَ یَشَآءُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ (آل عمران:۶)

وہی ہے (تمہارا رب) جو رحمِ مادر میں تمہاری صورت گری جس طرح چاہتا ہے کرتا ہے، اس کے سوا دوسرا کوئی الٰہ (حیرت انگیز کرشمے دکھانے والا) موجود نہیں ہے، وہ بڑا ہی غالب اور حکمت والا ہے۔

لَهٗ مَقَالِیْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ اِنَّهٗ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ (شوریٰ:۱۲)

آسمانوں اور زمین کی کنجیاں اسی کے ہاتھ میں ہیں، وہ جسے چاہتا ہے روزی کشادہ کرتا اور تنگ بھی کردیتا ہے، یقیناً وہ ہر چیز سے واقف ہے۔

غرض اللہ تعالیٰ سارے جہاں کا بادشاہ اور مختارِ کل ہے اور کوئی بھی اس کی مرضی کے بغیر دم نہیں مار سکتا، اس لیے اسے حق ہے کہ وہ جسے چاہے گمراہ کرے اور جسے چاہے ہدایت دے دے، اگر وہ چاہے تو تمام لوگوں کو اپنی قدرت کے اظہار کے طور پر ہدایت ضرور دے سکتا ہے، مگر اس کی مشیت یہی ہے کہ وہ اپنے بندوں کو آزمائے، لہٰذا اس نے اس سلسلے میں ایک عمومی ضابطہ تجویز کردیا ہے۔

وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰکُمْ اَجْمَعِیْنَ (نحل:۹)

اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّکَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا یَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِیْنَ (ہود:۱۱۸)

اگر تیرا رب چاہتا تو تمام لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتا (مگر) لوگ ہمیشہ اختلاف میں رہیں گے۔

اللہ ہدایت کسے دیتا ہے؟ حاصل یہ کہ باریٔ تعالیٰ کو مختارِ کل ہونے کے اعتبار سے پورا پورا اختیار ہے کہ وہ جسے چاہے ہدایت دے اور جسے چاہے گمراہ کردے، مگر وہ گمراہ اسی کو کرتا ہے جو ہدایت کا طالب نہ ہو جیسا کہ ارشادِ باری ہے:

قُلْ اِنَّ اللّٰهَ یُضِلُّ مَنْ یَّشَآءُ وَیَهْدِیْ اِلَیْهِ مَنْ اَنَابَ (رعد:۲۷)

کہہ دو کہ اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کردیتا ہے اور اپنے تک پہنچنے کا راستہ اسی کو دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے۔

اَللّٰهُ یَجْتَبِیْ اِلَیْهِ مَنْ یَّشَآءُ وَ

اللہ جسے چاہتا ہے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور اس کو

یَهْدِیْ اِلَیْهِ مَنْ یُّنِیْبُ (شوریٰ:۱۳)

راہ دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔

اس کے برعکس اللہ ان لوگوں کو ہدایت سے نہیں نوازتا جو فاسق، بدکردار اور ظالم ہوں اور جو اللہ کی آیات یا اس کے دلایلِ ربوبیت کا انکار کرکے گمراہی ہی پر اڑے رہنے والے ہوں، چند آیات ملاحظہ ہوں۔

وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ (آل عمران:۸۶)

اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ (مائدہ:۱۰۸)

اور تم اللہ سے ڈرو اور (اس کی بات) سنو (کیوں کہ) اللہ بدکردار لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ کَذَّابٌ (مومن:۲۸)

اللہ یقیناً اس شخص کو راہ یاب نہیں کرتا جو حد سے بڑھا ہوا اور کذاب ہے۔

بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ (جمعہ:۵)

بری مثال ہے ان لوگوں کی جنھوں نے اللہ کی نشانیوں کو جھٹلایا اور اللہ (ایسے) ناحق کوشوں کو راہِ ہدایت سے نہیں نوازتا۔

ان آیاتِ بینات کی رو سے یہ حقیقت پوری طرح آشکارا ہوگئی کہ ہدایت اسی کو ملتی ہے جو ہدایت کا طالب بھی ہو اور اللہ کی طرف رجوع و انابت کا راستہ اپنانے والا ہو، اس کے برعکس ہدایت اسے کسی بھی طرح نہیں مل سکتی جو گھمنڈی ہو اور فسق و فجور کا راستہ اختیار کرنے والا اور اللہ کی آیات یا اس کے دلایلِ ربوبیت کو جھٹلانے والا ہو، لہٰذا ہدایت یافتہ بننے کے لیے اس کی فکر ضروری ہے، ورنہ اللہ کسی کو زبردستی ہدایت نہیں دیتا۔

کفر اللہ کو ناپسند واقعہ یہ ہے کہ جن لوگوں کا گمراہ ہونا مقدر ہے وہ اللہ کی مشیت ہی کے تحت ہے، مگر اس میں اس کی رضامندی کو دخل نہیں ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کفر کو پسند نہیں کرتا، لہٰذا باریٔ تعالیٰ اپنے بندوں کی اس روش پر افسوس کا بھی اظہار کرتا ہے، چنانچہ اس سلسلے میں ارشادِ باری ہے۔

اِنْ تَکْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنْکُمْ وَلَا یَرْضٰی لِعِبَادِهِ الْکُفْرَ وَاِنْ

اگر تم کفر کا راستہ اختیار کروگے (تو اس سے اللہ کا کچھ بگڑنے والا نہیں ہے) کیوں کہ اللہ یقیناً تم سے بے نیاز

تَشْکُرُوْا یَرْضَہُ لَکُمْ (زمر: ۷) — ہے مگر وہ اپنے بندوں کے لیے کفر پسند نہیں کرتا اور اگر تم اس کے شکرگزار بنو تو وہ تم سے راضی ہو جائے گا۔

وَاِنَّا لَنَعْلَمُ اَنَّ مِنْکُمْ مُکَذِّبِیْنَ وَاِنَّہٗ لَحَسْرَۃٌ عَلَی الْکَافِرِیْنَ (حاقہ: ۴۹-۵۰) — ہم یقیناً جانتے ہیں کہ تم میں سے بعض (ہماری) تکذیب کرنے والے ہیں اور یہ بات بلاشبہ انکار کرنے والوں کے لیے باعثِ حسرت ہے۔

الغرض باری تعالیٰ نے اپنی ازلی تقدیر کی بنا پر بعضوں کے لیے جنت اور بعضوں کے دوزخ مقدر کر رکھی ہے، ورنہ اس پر لاعلمی کا الزام عائد ہوتا کہ وہ اپنے بندوں کے انجام سے واقف نہیں ہے، لیکن چوں کہ وہ ہمہ دان اور علام الغیوب ہے، لہذا وہ اپنے بندوں کے اعمال و احوال اور ان کے انجام سے خوب اچھی طرح واقف ہے، چنانچہ اس دنیا میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ سب اس کی مشیئت اور اس کے منصوبے کے مطابق ہی ہو رہا ہے۔

تقدیر کا مسئلہ اسلام کا ایک مشکل ترین مسئلہ ہے جو عقل انسانی کی گرفت میں پوری طرح نہیں آسکتا، مگر حدیث شریف کی تصریح کے مطابق اس پر ایمان لانا واجب ہے، ورنہ انسان کی نجات نہیں ہو سکتی، یعنی اس دنیا میں جو کچھ بھی خیر و شر موجود ہے وہ اللہ ہی کا پیدا کردہ ہے، (حتی تؤمن بالقدر خیرہ و شرہ) خود قرآن سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ (فلق: ۱-۲) — کہہ دو کہ میں صبح کے پیدا کرنے والے کی پناہ مانگتا ہوں، اس شر سے جو اس نے پیدا کر رکھا ہے۔

انسان مشین نہیں ہے اس بحث سے یہ خوبی واضح ہو گیا کہ انسان مجبور محض نہیں ہے جو ایک مشین کی طرح کام کرنے والا ہو، بلکہ وہ ارادہ و اختیار سے بھی متصف ہے، ورنہ پھر رجوع الی اللہ یا راہ ہدایت اختیار کرنے کا کوئی مفہوم ہی نہیں رہ جاتا اور اس کے سامنے علمی و عقلی دلایل کے بیان کی ضرورت ہی نہ تھی، انسان کو نظام کائنات میں غور و خوض کر کے دلایلِ ربوبیت کو سمجھنے کی دعوت اسی لیے تو دی گئی کہ وہ عقل و فکر کی قوتوں سے کام لے کر اس کائنات میں پھیلی ہوئی خدا کی نشانیوں کو پہچانے اور ان کے تقاضوں کے مطابق اپنے غلط رویہ کو درست کرے، ظاہر ہے کہ اس کا مطلب یہی تو ہے کہ انسان اپنے ارادہ و اختیار میں بہت بڑی حد تک آزاد ہے، خود زیر

بحث سورت ہی میں دیکھ لیجیے کہ سب سے پہلے اس کائنات میں زمانۂ مستقبل میں واقع ہونے والے بعض طبیعی حوادث کا ذکر کرتے ہوئے نوع انسانی کو متنبہ کیا گیا ہے کہ قیامت کا دن ضرور آنے والا ہے، جس کی شہادت سورج اور ستارے دے رہے ہیں، پھر کلام الٰہی اور رسالت محمدی کے برحق ہونے پر آسمانی دنیا کی گواہی پیش کی گئی، پھر اس کے بعد نوع انسانی کو دعوت دی گئی ہے کہ تم میں سے جو چاہے وہ اپنے ارادہ و اختیار کو استعمال کرتے ہوئے خدائی راستہ اختیار کر سکتا ہے، تو اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ انسان پوری طرح مجبور اور بے بس نہیں ہے، تقدیر اپنی جگہ پر، مگر کوئی شخص یہ نہیں جانتا کہ اس کی تقدیر کیا ہے؟ لہذا اسے اپنے ارادہ و اختیار سے فرار کی کوئی گنجایش نہیں ہے، اگر وہ اپنے ارادہ و اختیار کو استعمال کرے گا تو یہی اس کی تقدیر ہوگی ورنہ اگر کوئی اپنے اس ارادہ و اختیار کو معطل کر کے ''جبریت پسند'' بن جائے گا تو یہی اس کی تقدیر ہوگی، لہذا ہر شخص کو اپنے ارادہ و اختیار کا استعمال ضرور کرنا چاہیے، ورنہ اس کا شمار بہایم اور چوپایوں میں ہوگا، جو غور و فکر اور ارادہ و اختیار کی آزادی سے بالکل محروم ہیں، کیوں کہ ان کی ایک محدود اور لگی بندھی زندگی ہے جو کھانے پینے ہی تک محدود ہے اور ایسے ہی لوگوں کی قرآن مجید میں مذمت کی گئی ہے جو سوائے کھانے پینے اور موج مستی کرنے کے اور کچھ بھی نہیں جانتے جیسا کہ ارشاد باری ہے۔

وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَتَمَتَّعُوْنَ وَ یَاْکُلُوْنَ کَمَا تَاْکُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًی لَّھُمْ (محمد: ۱۲) — اور جنہوں نے اللہ کا انکار کیا تو وہ (دنیا میں) عیش کرتے ہیں اور اس طرح کھاتے ہیں جس طرح چوپایے کھاتے ہیں، تو ایسے لوگوں کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔

حاصل یہ کہ انسان اس دنیا میں نہ تو پوری طرح آزاد ہے اور نہ پوری طرح مجبور، بلکہ ایک حیثیت سے آزاد ہے تو دوسری حیثیت سے مجبور، مگر دنیا میں ایسی بہت سی قومیں گزری ہیں جو انسان کو یا تو مجبور محض یا پھر مختار کل قرار دیتی تھیں، اول کو اصطلاحاً ''جبریہ'' اور ثانی کو ''قدریہ'' کہا جاتا ہے، خود اسلام میں بھی بعض فرقے جبریہ اور بعض قدریہ گزر چکے ہیں اور عصر جدید میں مادہ پرست (خصوصاً اٹھارویں اور انیسویں صدی کے) جبریت پسند تھے اور ہیں، جو انسان کو ایک مشین کی طرح مجبور محض قرار دیتے ہیں، چنانچہ آج بھی ''کرداریت'' (۲) کے علم بردار (جن کا مرکز امریکہ ہے) انسان کو ارادہ و اختیار سے عاری ایک مشین قرار دے کر اسے دنیوی عیش اور موج مستی ہی میں مگن رہنے کی

تلقین کرتے ہیں، اس قسم کے عیاش لوگوں کے لیے تقدیر الٰہی ایک بہانہ بن سکتی ہے، مگر شرعی و عقلی دلایل کی رُو سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انسان مجبور محض نہیں ہے، ورنہ پھر عقل و شعور اور نظام دلایل کی کوئی اہمیت ہی نہیں رہ جاتی اور انسان پر اللہ کی حجت کبھی پوری نہیں ہو سکتی۔

کائنات کی تقدیر اور تدبیر واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چوں کہ اس پوری کائنات کا خالق اور رب (کارساز) ہونے کے علاوہ حکیم مطلق بھی ہے اس لیے وہ اپنا ہر کام ایک مکمل منصوبے اور دانش مندی کے تحت کرتا ہے اور اس کا کوئی بھی فعل اَلل ٹپ اور رواداری میں نہیں ہوتا، خدائی منصوبہ بندی اور نظم و نسق کی تعبیر کتاب الٰہی میں ''تقدیر'' اور ''تدبیر'' کے الفاظ سے کی گئی ہے، چنانچہ ایک وقت ایسا بھی تھا کہ جب یہ کائنات موجود نہیں تھی، اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس کی تخلیق کا منصوبہ بنایا اور پھر اسے عدم سے وجود میں لایا، بعض حدیثوں میں مذکور ہے کہ ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کی تقدیر زمین اور آسمانوں کو پیدا کرنے سے پچاس ہزار سال پہلے ہی لکھ دی تھی'' (۳)، اس تقدیر الٰہی کے بعض اصول و ضوابط حسب ذیل آیتوں میں مذکور ہیں۔

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا (فرقان: ۲)

اس نے ہر چیز پیدا کی اور اس کا ایک (طبعی) ضابطہ مقرر کیا۔

إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ وَمَا أَمْرُنَا إِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ (قمر: ۴۹-۵۰)

ہم نے ہر چیز یقیناً ایک خاص منصوبے سے پیدا کی ہے اور ہمارا حکم (کسی چیز کے لیے) صرف ایک بات (کُن) ہوتی ہے، جیسا کہ پلک کا جھپکنا (اور وہ ہو جاتی ہے)۔

چنانچہ یہ پوری کائنات اور اس کے تمام مظاہر خالق کائنات کی اس ازلی منصوبہ بندی کے تحت رواں دواں ہیں اور وہ ان نظاموں کی پوری باقاعدگی کے ساتھ نگرانی اور دیکھ بھال کر رہا ہے، جیسا کہ حسب ذیل آیات سے یہ حقیقت پوری طرح واشگاف ہوتی ہے۔

فَالِقُ الْإِصْبَاحِ وَجَعَلَ اللَّيْلَ سَكَنًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ (انعام: ۹۶)

وہ صبح کو نکالنے والا ہے اور اس نے رات کو سکون کا ذریعہ بنایا اور آفتاب و ماہتاب کا ایک حساب مقرر کیا، یہ ہے منصوبہ ایک زبردست اور ہمہ دان ہستی کا۔

هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا وَقَدَّرَهُ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ مَا خَلَقَ اللَّهُ ذَٰلِكَ إِلَّا بِالْحَقِّ يُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ (یونس: ۵)

وہی ہے تمہارا رب جس نے سورج کو روشن اور چاند کو منور بنایا اور اس کی منزلیں مقرر کیں، تا کہ تم برسوں کی تعداد اور حساب معلوم کر سکو، اللہ نے اسے پوری حقانیت (حکمت و مصلحت) کے ساتھ پیدا کیا ہے، (چنانچہ) وہ اپنی نشانیاں اہل علم کے لیے تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَهَا ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ (یٰس: ۳۸)

اور سورج اپنے مستقر کی طرف دوڑ رہا ہے، یہ ہے منصوبہ ایک زبردست اور باخبر ہستی کا۔

وَزَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَحِفْظًا ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ (حٰم سجدہ: ۱۲)

اور ہم نے قریبی آسمان کو چراغوں سے آراستہ کیا اور اسے محفوظ بنا دیا ہے، یہ ہے منصوبہ ایک زبردست اور ہمہ دان ہستی کا۔

اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ مَا لَكُمْ مِنْ دُونِهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا شَفِيعٍ أَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّونَ ذَٰلِكَ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ (سجدہ: ۴-۶)

اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین اور ان دونوں کی درمیانی چیزوں کو چھ دنوں (چھ مدارج) میں پیدا کیا پھر وہ عرش پر متمکن ہوا، تمہارے لیے اس کے سوا نہ کوئی (حقیقی) دوست ہے اور نہ کوئی سفارشی، تو کیا تم کو (اس حقیقت پر) انتباہ نہیں ہوتا؟ وہ آسمان سے لے کر زمین تک پورے معاملے کی تدبیر کر رہا ہے، پھر وہ معاملہ چڑھ کر اس کے پاس پہنچے گا ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمہاری گنتی کے مطابق ایک ہزار سال ہے، یہی ہے عالم غیب اور عالم شہادت کا علم رکھنے والا جو نہایت درجہ غالب اور رحم دل ہے۔

ربوبیت کی ہمہ گیری کائنات اور اس کے مظاہر کی یہی وہ تقدیر (پلاننگ) اور تدبیر (نظم و نسق) ہے جس کے مجموعے کا نام ''ربوبیت'' یا اس کائنات کی کارسازی ہے، چنانچہ خلاقِ

عالم کی اس ربوبیت اور اس کی کارسازی سے اس کائنات کا کوئی ذرہ تک آزاد نہیں ہے، زمین سے لے کر آسمان تک اور عرش سے فرش تک اس کی ربوبیت ہر چیز اور ہر مظہر فطرت پر محیط ہے اور خود انسان بھی ربوبیت کے ان ہمہ گیر بندھنوں میں پوری طرح جکڑا ہوا ہے، جن سے اسے کوئی مفر نہیں ہے چنانچہ انسان کا ایک ایک عضو اور اس کی ایک ایک سانس تک طبیعی و حیاتیاتی نقطۂ نظر سے ربوبیت کی مضبوط بیڑیوں میں جکڑی ہوئی ہے، بہ الفاظ دیگر انسان جسمانی اعتبار سے جن طبیعی و حیاتیاتی نظاموں میں بندھا ہوا ہے انہیں وہ کسی بھی طرح توڑ نہیں سکتا اور ربوبیت کی جکڑبندیوں سے آزاد نہیں ہوسکتا، چنانچہ نظام تنفس، نظام دوران خون، نظام تغذیہ، نظام بول و براز اور نظام افزائش نسل وغیرہ وغیرہ کو بدل نہیں سکتا اور ان ضوابطِ ربوبیت کی خلاف ورزی نہیں کرسکتا (وَهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ)۔

غرض یہ پوری کائنات اپنے تمام حیرت انگیز نظاموں سمیت بشمول انسان خدا کی تقدیر اور تدبیر کے گرد گھوم رہی ہے، جو ربوبیت کے دو بازو ہیں، مگر انسان اور مظاہر کائنات کے درمیان فرق یہ ہے کہ انسان کو چھوڑ کر بقیہ تمام مظاہر اپنی ذاتی مشیئت سے سرفراز نہیں کیے گئے ہیں، بلکہ وہ اس معاملے میں مجبور محض ہیں اور کارسازِ عالم نے ان کے لیے جو طبیعی ضوابط مقرر کردیے ہیں ان سے وہ سرمو بھی تجاوز نہیں کرسکتے، لیکن چوں کہ انسان کو ابتلا و آزمائش کی غرض سے پیدا کیا گیا ہے، اس لیے اسے ارادہ و اختیار سے بھی نوازا گیا ہے تاکہ باری تعالیٰ کا منصوبہ پورا ہوسکے۔

تَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا وَهُوَ الْعَزِيزُ الْغَفُورُ (ملک:۱-۲)

بڑا بابرکت ہے وہ جس کے دست قدرت میں (اس پوری کائنات کی) بادشاہی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، اسی نے موت اور حیات کو پیدا کیا تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون اچھا عمل کرتا ہے، وہ بڑا غالب اور بخشنے والا ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر انسان کو یہ ارادہ و اختیار حاصل نہ ہوتا تو پھر اس میں اور ایک درخت یا پتھر یا بندر میں کوئی فرق نہ ہوتا، مگر جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا "قدریہ" کے عقیدے کے مطابق یہ اختیار مطلق نہیں بلکہ محدود ہے، مگر ہے ضرور، ورنہ قرآن حکیم کی وہ تمام آیات مہمل قرار پائیں گی

جن کے مطابق انسان کو اپنی مرضی سے صحیح راستہ اختیار کرنے اور نیک عمل کرنے پر ابھارا گیا ہے۔

تقدیر کا اثبات دراصل علم الٰہی کے "قدیم" ہونے کا اثبات ہے، ورنہ پھر اس کا رد ہوجائے گا، یعنی تقدیر کے انکار سے یہ بات لازم آئے گی کہ باری تعالیٰ اپنے بندوں کے اعمال و افعال اور ان کے نیک و بد ہونے سے ناواقف تھا، حالاں کہ قرآن مجید کی تصریحات کے مطابق وہ ہر چیز اور ہر بات سے بہ خوبی واقف ہے، ورنہ پھر اس کی منصوبہ بندی کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی، بلکہ اس سے جہاں ایک طرف تقدیر الٰہی کی نفی ہوتی تو دوسری طرف اس کا "جہل" بھی ثابت ہوجاتا، معاذ اللہ، حالاں کہ قرآن حکیم صراحتاً اعلان کرتا ہے۔

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (انعام:۱۰۱)

اس نے ہر چیز پیدا کی ہے اور وہ ہر چیز سے بہ خوبی واقف ہے۔

هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (زخرف:۸۴)

وہی ہے جو آسمان میں بھی اللہ ہے اور زمین میں بھی اللہ ہے اور وہ حکمت والا اور (سب کچھ) جاننے والا ہے۔

أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ وَأَنَّ اللَّهَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ (توبہ:۷۸)

کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ ان کے بھیدوں اور سرگوشیوں سے بھی واقف ہے اور یہ کہ اللہ غیب کی باتوں کو بہ خوبی جانتا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ عَالِمُ غَيْبِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ (فاطر:۳۸)

اللہ یقیناً آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ باتوں کو جاننے والا ہے اور وہ دلوں کے حالات سے بھی خوب واقف ہے۔

ہدایت پانے کی شرطیں

حاصلِ بحث یہ کہ اس دنیا میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے اور جو طبیعی حوادث واقع ہو رہے ہیں وہ سب بخت و اتفاق کے تحت یا الل ٹپ نہیں بلکہ تقدیر الٰہی اور تدبیر الٰہی کے تحت ظہور میں آرہے ہیں اور انسان بھی اس ہمہ گیر تقدیر سے آزاد نہیں ہے، چنانچہ اللہ کی مشیئت کے تحت تمام انسانوں کی تقدیر پہلے ہی سے طے ہوچکی ہے کہ فلاں بندہ ہدایت یافتہ بنے گا اور فلاں گمراہ ہوگا، مگر اس کے ساتھ ساتھ اس نے یہ بھی طے کردیا ہے کہ جو گمراہ ہوگا وہ اپنی مرضی سے

ہوگا، لہٰذا ہر شخص کو ہدایت یافتہ بننے کی کوشش کرنی چاہیے اور اس کے لیے تین شرطیں ہیں۔

۱۔ پہلی شرط یہ ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرے۔

۲۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ اللہ سے ڈرے۔

۳۔ اور تیسری شرط یہ ہے کہ وہ کلمۂ طیبہ یعنی لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا اقرار کرے۔

تو ایسے شخص کے لیے اللہ ہدایت کے راستے کھول دے گا، اس کے برعکس جس نے ان تینوں باتوں کا انکار کیا تو وہ شقی القلب اور دائمی عذاب کا مستحق ہوگا اور ایسے شخص کے لیے اللہ گمراہی کے راستے آسان کردے گا، چنانچہ فرمانِ الٰہی ہے۔

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰی وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی وَکَذَّبَ بِالْحُسْنٰی فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰی
(لیل: ۵-۱۰)

تو جس نے (راہ خدا میں) خرچ کیا اور اللہ سے ڈرا اور اچھی بات کی تصدیق کی تو ہم اس کے لیے (خیر کا) راستہ آسان کردیں گے، اب رہا وہ شخص جس نے بخل سے کام لیا اور (اللہ سے) بے نیازی اختیار کی اور اچھی بات (کلمۂ الٰہی) کو جھٹلایا تو ہم اس کے لیے (دوزخ کا) راستہ آسان کردیں گے۔

مطلب یہ کہ اللہ ہر شخص کو اسی میں آسانی پیدا کردیتا ہے جو وہ اپنے لیے منتخب کرتا ہے، یعنی انسان جو بھی ارادہ کرتا ہے تو اللہ اسی میں اسے سہولت دیتا ہے، اس کی تعبیر اہل سنت والجماعت کے عقیدے کی رُو سے اس طرح ہے کہ "انسان اپنے اعمال کا کاسب ہے، جب کہ ان اعمال کا خالق اللہ ہے" (۴) اس اعتبار سے اللہ کی مشیئت اور بندے کی مشیئت دونوں کا اثبات ہوجاتا ہے اور کوئی تعارض باقی نہیں رہتا، واللہ اعلم۔

انسان کے سامنے دو راستے کھلے ہوئے ہیں کہ اگر وہ چاہے تو خیر کا راستہ اختیار کرے یا شر کا، جیسا کہ ارشاد باری ہے۔

اِنَّا هَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّ اِمَّا کَفُوْرًا
(دہر: ۳)

ہم نے اسے بلاشبہ (اپنا) راستہ دکھایا ہے (تو اب اسے اختیار ہے کہ) وہ یا تو (صحیح راستہ اختیار کرکے) شکر گزار بنے یا پھر (غلط راستہ اختیار کرکے) نافرمان ہوجائے۔

الغرض تقدیر انسانوں کے لیے ایک "مجہول" چیز ہے، جب کہ ان کے سامنے صرف "عمل" کا راستہ کھلا ہوا ہے، لہٰذا ہر شخص عمل کا راستہ اپناتے ہوئے اپنی تقدیر خود بنا سکتا ہے اور اسی میں اس کی عافیت ہے، ظاہر ہے کہ اگر ہر شخص اپنی تقدیر کا حال جان لیتا تو پھر اس کے لیے عمل کرنے کی ضرورت ہی نہ رہ جاتی، اسی لیے حدیث شریف کے الفاظ بہت بلیغ اور حکیمانہ ہیں کہ "تم عمل کیے جاؤ، ہر شخص کو اسی میں آسانی دی جائے گی جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے"، چنانچہ ہر انسان کے لیے یہی ایک صائب اور معقول حل ہے کہ وہ خدا کے حکموں کے مطابق عمل کرتے ہوئے ہمیشہ اپنی عافیت کی دعا مانگتا رہے، ورنہ اس کا کوئی بھی غلط فعل اسے صراط مستقیم سے ہٹا دے گا، جس کے باعث وہ ابدی لعنتوں کا مستحق بن جائے گا۔

اسلام کے جملہ عقائد کا اثبات

سورۂ تکویر مختصر ہونے کے باوجود نہایت درجہ جامع اور حیرت انگیز طور پر تمام اسلامی عقائد کا سائنٹفک طور پر اثبات کرنے والی ہے، زیر بحث مسئلے میں راقم کی نظر میں اتنی جامع کوئی دوسری سورت موجود نہیں ہے، یہ درحقیقت دریا بکوزہ کا مصداق ہے، اس سورہ کے مباحث سے اسلام کے تمام بنیادی عقائد روشنی میں آجاتے ہیں جو نوع انسانی کو متنبہ کرکے عقلی اعتبار سے اس کی تشفی کا سامان فراہم کرنے والے ہیں، یہ حقایق موجودہ مادیت کی ماری ہوئی انسانیت کے لیے ایک دوائے شافی کی حیثیت رکھتے ہیں، جن کو اب اور زیادہ نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

اسلام کے بنیادی عقاید یہ ہیں:- ۱۔ اللہ پر ایمان، ۲۔ فرشتوں پر ایمان، ۳۔ اللہ کی بھیجی ہوئی کتابوں پر ایمان، ۴۔ رسولوں پر ایمان، ۵۔ یوم آخرت یا دوبارہ اٹھائے جانے پر ایمان، ۶۔ اللہ کی تقدیر پر ایمان، کہ اس دنیا میں جو بھی خیر و شر موجود ہے، وہ اللہ کی طرف سے ہے، چنانچہ اس کی تعبیر اس طرح کی گئی ہے۔

اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِکَتِهٖ وَکُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَیْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰی وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ

یعنی میں ایمان لایا اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، یوم آخرت پر، تقدیر پر کہ اس کا خیر و شر اللہ کی طرف سے ہے اور موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے پر۔

اس سورہ سے پہلے خدا کا وجود اور اس کی تقدیر کا اثبات ہوتا ہے کہ اللہ تعالی نے ایک مکمل منصوبے کے مطابق یہ کائنات بنائی اور اس کے طبعی ضوابط مقرر کیے اور پھر اسے ایک وقت مقررہ تک کے لیے محدود رکھا، چنانچہ جب یہ وقت مقررہ (اجلِ مُسمّٰی) آجائے گا تو یہ پوری کائنات ایک ٹائم بم کی طرح پھٹ کر بکھر جائے گی اور پھر حساب کتاب کے لیے اسے نئے سرے سے بسایا جائے گا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تمام واقعات رب العالمین کے ازلی منصوبے کے عین مطابق واقع ہو رہے ہیں اور اس میں ذرا بھی کمی بیشی نہیں ہو رہی ہے، اسی بنا پر قرآن عظیم میں ان سب واقعات کی خبریں پہلے ہی سے بہ طور پیش گوئی درج کر دی گئی ہیں تا کہ آیندہ چل کر جب واقعات کی علامتیں سامنے آئیں تو اس سے کلام الٰہی کی تصدیق و تائید ہو جائے، اس اعتبار سے اس موقع پر دو عظیم اور ناقابلِ تردید حقیقتیں سامنے آتی ہیں: اول یہ کہ اس کائنات کا ایک خالق و کارساز ضرور موجود ہے اور دوم یہ کہ وہ اپنی تخلیقات کے تمام بھیدوں یا اندرونی رازوں سے بہ خوبی واقف ہے، ورنہ ان رموز و اسرار کی پیش خبری ممکن نہ ہوتی، یہی خدائے خلاق ہے جو ہر چیز کی حقیقت و ماہیت سے بہ خوبی واقف ہے۔

پھر اس کے بعد قرآن کا کلام الٰہی ہونا ثابت ہوتا ہے، جس کی صداقت کی گواہی نظام کائنات اور خاص کر آسمانی دنیا دے رہی ہے، اس طرح قرآن کی سچائی دو طریقوں سے ثابت ہوتی ہے: ایک اس کی غیبی خبروں یا اس کی علمی پیش گوئیوں کے مدنظر، جس کی حقانیت پر جدید سائنسی تحقیقات و اکتشافات مہر تصدیق ثبت کر رہے ہیں اور دوسرے آسمانی نظام کی گواہی کہ یہ پورا سلسلۂ وجود تقدیرِ الٰہی کے مطابق رواں دواں ہے، چنانچہ اس جلوۂ ربوبیت کے باعث سلسلۂ وحی کا بھی اثبات ہوتا ہے جو انبیائے کرام پر خدائے خلاق و علام کی جانب سے آتی رہتی ہے، اس سے تمام کتب سماوی کی حقانیت بھی ثابت ہوتی ہے، اسی طرح ملائکہ کا وجود بھی ثابت ہوتا ہے جو اللہ اور اس کے پیغمبروں کے درمیان پیغام رسانی کا واسطہ ہیں اور پھر سب سے آخر میں اللہ کی مشیئت کا اثبات ہوتا ہے کہ یہ پوری کائنات اس کی ہمہ گیر منصوبہ بندی ہی کے تحت وجود میں آئی اور اس کی مشیئت ہی کے تحت جاری و ساری ہے، اس طرح اسلام کے تمام بنیادی عقاید سائنسی نقطۂ نظر سے پوری طرح کھل کر سامنے آجاتے ہیں اور یقین کرنے والوں کے لیے کسی قسم کے شک و شبہ کی

گنجایش باقی نہیں رہ جاتی، اس لحاظ سے یہ چھوٹی سی سورت اپنے حیرت انگیز حقایق کی رُو سے ایک معجزہ ہے جو عالم انسانی کو غفلت کی نیند سے جگانے کے لیے بہت کافی ہے۔

ان تمام اعتبارات سے اسلام ایک خالص سائنٹفک دین ہے، جس میں بے عقلی اور تاریک خیالی کی کوئی بات موجود نہیں ہے، لہٰذا ان حقایق کے واضح ہو جانے کے بعد اب تمام بنی آدم کو اپنی نجات کی فکر کرنی چاہیے۔

عصر جدید میں قرآن کی تجلّیاں

ربوبیت کی یہ وہ تجلیاں ہیں جن سے آج سارا عالم بقعۂ نور بنا ہوا ہے اور ان تجلیوں کے ذریعہ قرآن عظیم کا برحق اور من جانب اللہ ہونا دن کی روشنی میں پوری طرح ثابت ہو جاتا ہے، اس سے ایک بہت بڑی حقیقت یہ بھی ثابت ہوتی ہے کہ علم صرف وہی نہیں ہے جو سائنسی تحقیقات کے ذریعہ حاصل ہو (جیسا کہ عصر جدید کے مادہ پرستانہ فلسفوں کا دعویٰ ہے) بلکہ علم کا ایک اور ذریعہ جو بالکل بے خطا ہے وہ وحی الٰہی ہے، اس جلوۂ الٰہی کے ذریعہ ایک اور حقیقت یہ بھی ثابت ہوتی ہے کہ انسانی علم یا سائنسی تحقیق و تدقیق میں کبھی کبھار غلطی ہو سکتی ہے مگر وحی الٰہی میں کسی بھی قسم کی غلطی یا اشتباہ کا امکان نہیں ہے، ورنہ پھر سائنسی علم وحی الٰہی اور علم الٰہی کی تصدیق و تائید کبھی نہیں کر سکتا تھا، چنانچہ جدید ترین اکتشافات علم الٰہی کے ایک ایک جزیے کی سچائی پر مہر لگاتے ہوئے طبیعیات اور مابعد الطبیعیات میں ربط و تعلق پر نئے نئے دلایل خود اپنی طرف سے اس طرح فراہم کر رہے ہیں گویا کہ وہ الحاد و مادیت کی تردید میں اسلام اور قرآن کے وکیل ہوں، بہ الفاظ دیگر جدید سائنسی اکتشافات آج مادہ پرستوں کو ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا کر کے ان پر فرد جرم عاید کر رہے ہیں، تو کیا سائنس اور فلسفے کی دنیا میں یہ ایک انوکھا واقعہ نہیں ہے؟ قرآن عظیم اور رسالت محمدی ﷺ کی صحت و صداقت کا اس سے بڑا علمی اور تاریخی ثبوت اور کیا چاہیے؟ ظاہر ہے کہ یہ علمی دنیا کا ایک عجیب و غریب واقعہ ہے کہ اسلامی عقاید و تعلیمات اور قرآن کی سچائی ظاہر کرنے کے لیے اسلام کو اپنی طرف سے کوئی ثبوت پیش کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت باقی نہیں رہی، بلکہ علم انسانی یا سائنسی علم خود ہی اپنی تحقیقات کے ذریعہ اسلام کی حقانیت کا علمی ثبوت پیش کرتے ہوئے مادیت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک رہا ہے، اسی لیے خلاق ازل نے اپنی کتاب ابدی کے ذریعہ نظام کائنات میں غور و خوض اور مظاہر فطرت کی چھان بین کی دعوت دی تھی تا کہ ان کے نظاموں کے اندر نقاش فطرت نے جو

"علمی شہادت" رکھ چھوڑی ہے وہ کھل کر سامنے آجائے اور اس کے نتیجے میں عالم انسانی پر اللہ کی حجت مؤثر طور پر پوری ہوجائے، یہ بھی خدائی تقدیر اور اس کی بے مثال منصوبہ بندی ہی کا ایک حصہ ہے، یہ پورے عالم انسانی کے لیے ایک لمحۂ فکریہ ہے، اسی لیے قرآن عظیم کو سارے جہاں کو خبردار کرنے کی غرض سے بھیجا گیا ہے۔

تَبَارَكَ الَّذِىْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا (فرقان:۱)

بڑا ہی بابرکت ہے وہ جس نے اپنے بندے (محمد) پر فرقان (حق و باطل میں فرق کرنے والی کسوٹی) نازل کی تا کہ وہ سارے جہاں کو متنبہ کر سکے۔

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ وَ لَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ (ص:۸۷-۸۸)

یہ تو سارے جہاں کے لیے ایک یاددہانی ہے اور تم اس کی (سچائی کی) خبر کچھ عرصہ بعد ضرور جان لوگے۔

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ (تکویر:۲۷-۲۸)

یہ تو سارے جہاں کے لیے ایک تذکرہ ہے لہذا تم میں سے جو چاہے وہ سیدھا ہوجائے۔

كَلَّآ اِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ (مدثر:۵۴-۵۵)

نہیں نہیں، یہ تو ایک سبق ہے، جو چاہے اس سے عبرت پکڑے۔

ایک خوش خبری اور ایک انتباہ

یہ قرآن عظیم کی وہ تجلیاں ہیں جو عصر جدید میں پوری طرح ظاہر و نمایاں ہوکر سارے جہاں کو نورِ الٰہی سے روشن و منور کرنا چاہتی ہیں، لہذا بڑے ہی خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اس نور خدا کی طرف لپکتے ہوئے کفر و الحاد کی تاریکیوں سے ہمیشہ کے لیے باہر آجائیں اور ایسے ہی لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ اپنی رحمت و مغفرت کے دروازے کھول دے گا۔

چنانچہ ایسے ہی خوش نصیبوں کے لیے حسب ذیل آیات میں بشارت سنائی گئی ہے کہ وہ گمراہی کا راستہ ترک کرکے صراط مستقیم کی طرف آجائیں تو اللہ ان کے تمام گناہوں کو معاف کردے گا، ورنہ وہ قیامت کے دن کفِ افسوس ملتے رہ جائیں گے۔

قُلْ يٰعِبَادِىَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ

اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَ اَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِىْ جَنْۢبِ اللّٰهِ وَاِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِيْنَ اَوْ تَقُوْلَ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰىنِىْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ اَوْ تَقُوْلَ حِيْنَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ اَنَّ لِىْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ بَلٰى قَدْ جَآءَتْكَ اٰيٰتِىْ فَكَذَّبْتَ بِهَا وَاسْتَكْبَرْتَ وَكُنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ اَلَيْسَ فِىْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ وَيُنَجِّى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِهِمْ لَا يَمَسُّهُمُ السُّوْٓءُ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ

کہہ دو کہ اے میرے بندو! جنہوں نے اپنے آپ پر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ، اللہ یقیناً تمام گناہوں کو بخش دے گا، کیوں کہ وہ بہت زیادہ بخشنے والا اور رحم دل ہے، لہذا تم اپنے رب کی طرف رجوع کرو اور (اسلام قبول کرکے) اس کے فرماں بردار بن جاؤ قبل اس کے کہ تمہارے پاس (اللہ کا) عذاب آجائے، تب تمہیں کوئی مہلت نہیں ملے گی، اس لیے تم اتباع کرو اس بہترین پیغام کا جو تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے اتارا گیا ہے، اس سے پہلے کہ (اللہ کا) عذاب اچانک تمہارے پاس اس طرح آجائے کہ تمہیں خبر بھی نہ ہو، (ایسا نہ ہو کہ) کوئی شخص یہ کہنے لگ جائے کہ ہائے افسوس کہ میں نے اللہ کے حق میں کوتاہی کی، کیوں کہ میں تو (اللہ کی ہدایت) کا مذاق ہی اڑاتا رہا، یا وہ یہ کہنے لگے کہ اگر اللہ مجھے ہدایت دیتا تو میں بھی اللہ والا بن جاتا، یا وہ جب عذاب دیکھ لے تو یوں کہنے لگ جائے کہ کاش مجھے (پھر سے دنیا میں) واپس جانا میسر ہوجاتا تو میں نیک آدمی بن جاتا بلکہ (واقعہ یہ ہے کہ) تیرے پاس ہماری نشانیاں (دلائل ربوبیت) آچکے تھے، مگر تو نے انہیں جھٹلایا اور تکبر کیا اور پھر تو منکر بن گیا، (غرض اے مخاطب) تو قیامت کے دن ان لوگوں کو دیکھے گا جنہوں نے اللہ پر جھوٹ باندھا تھا کہ ان کے چہرے سیاہ ہوچکے ہوں گے، تو کیا جہنم تکبر کرنے والوں کا ٹھکانہ نہیں ہے؟ اور

(زمر: ۵۳-۶۱)

اللہ ان لوگوں کو نجات سے ہم کنار کرے گا جنہوں نے تقویٰ کا راستہ اختیار کیا، ان کی کامیابی کی بنا پر انہیں (کوئی) تکلیف نہیں ہوگی اور نہ وہ غم گین ہوں گے۔

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ وَمَا يَكْفُرُ بِهَا اِلَّا الْفَاسِقُوْنَ (بقرہ:۹۹)

ہم نے آپ کے پاس کھلے کھلے دلایل بھیج دیے ہیں، جن کا انکار بدکردار لوگ ہی کر سکتے ہیں۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَاهُ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ وَاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِي مَنْ يُرِيْدُ (حج:۱۶)

اور اسی طرح ہم نے اس کتاب کو کھلی کھلی نشانیوں کے ساتھ اتارا ہے اور اللہ اسی کو ہدایت دیتا ہے جو (ہدایت کا) ارادہ کرتا ہے۔

حواشی

(۱) بخاری، مسلم، ابوداؤد، مسند احمد بن حنبل (بحوالہ شفاء الغلیل، از علامہ ابن قیم، ص ۲۳، مطبوعہ مصر)۔ (۲) BEHAVIOURISM (۳) صحیح مسلم، ۴/۴۴، ۲۰، مطبوعہ ریاض۔ (۴) دیکھیے شرح فقہ اکبر، ص ۷۸، مطبوعہ بیروت، نیز شرح الطحاویہ، ص ۲۲۵، مطبوعہ سعودی عرب۔

ارض القرآن (مکمل)

از مولانا سید سلیمان ندویؒ

اس کے دونوں حصے اب ایک ہی جلد میں شایع کیے گئے ہیں، حصہ اول میں عرب کا قدیم جغرافیہ، عاد، ثمود، سبا، اصحاب الایکہ وغیرہ کے حالات، قدیم یونانی، رومی اور اسرائیلی لٹریچر کی روشنی میں قلم بند کیے گئے ہیں، حصہ دوم میں بنوابراہیم کی تاریخ پر قرآن مجید، توراۃ اور تاریخ یونان وروم کے بیان کے مطابق تحقیقات ومباحث ہیں۔ قیمت: ۱۳۸/روپے

بیدل کی شخصیت اور ان کا اسلوب

از جناب فخر عالم صاحب☆

تخت طاؤس کے مالک شہنشاہ شاہ جہاں جب ہندوستان میں داد حکمرانی دے رہے تھے اور سترہویں صدی کا نصف اول گذرنے کو تھا کہ عظیم آباد (پٹنہ، بہار) میں عبدالقادر بیدل پیدا ہوئے (۱)، اس وقت شاہ جہاں کی شان وشوکت انتہائی عروج پر تھی، ملک میں امن وامان اور خوش حالی کا دور دورہ تھا، تجارت اور صنعت وحرفت کو فروغ حاصل تھا اور مختلف قسم کے فنون آزادانہ طور پر بھی اور دربار شاہی کی سرپرستی میں بھی خوب ترقی پذیر تھے، علم وادب پر بھی ان دنوں بہار آئی ہوئی تھی، اس عہد کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے ہمیں کئی ممتاز اہل علم اور بڑے بلند فطرت، شاعروں اور ادیبوں کا پتہ چلتا ہے، جہاں پر یہ ذہین وطباع بچہ پیدا ہوا تھا وہاں علم وفن کی روایت پہلے سے موجود تھی،

---

(۱) پٹنہ کا قدیم نام عظیم آباد ہے، قبل مسیح موریا عہد حکومت میں اس کا نام پاٹلی [illegible] رہ چکا ہے، کچھ دانش وروں کا قیاس ہے کہ بیدل کی جائے پیدایش اکبرنگر، ضلع بارڑہ، نزدیک پٹنہ اور کچھ کے نزدیک اکبرنگر راج محل، ضلع بھاگل پور (بہار) ہے، مگر تذکروں اور دیگر حوالوں میں وہ عظیم آبادی یا دہلوی کے نام سے مشہور ہیں۔

(معارف) مرزا بیدل کے وطن کے متعلق مولانا سید سلیمان ندوی نے معارف اگست ۱۹۴۶ء میں ایک محققانہ مضمون لکھا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ خوش گو نے ان کو "اکبرآبادی الوطن" لکھا ہے، میر غلام علی آزاد نے اپنے تین تذکروں ید بیضا، سرو آزاد اور خزانہ عامرہ میں ان کی جائے پیدایش تصریح کے ساتھ پٹنہ عظیم آباد لکھی ہے، علی قلی ہدایت نے دہلوی، نصرآبادی نے لاہوری لکھا ہے، میر قدرت اللہ قاسم نے بیدل کو بخاری المولد لکھا ہے جس کو سب سے عجیب بیان بتایا ہے، سید صاحب کی تحقیق میں بیدل کا مولد ومنشا صوبہ بہار تھا جس کا دارالحکومت عظیم آباد پٹنہ تھا، باقی اقوال کی انہوں نے مناسب توجیہ کی ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ "بیدل کو صوبہ بہار سے موروثی تعلق تھا اور اگر اس کو عظیم آبادی کہنے میں تامل ہو تو بہاری کہنے میں تو مطلق تامل نہیں (معارف اگست ۱۹۴۶ء، ص ۹۴)۔

☆ شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی، دہلی

قرون وسطی میں اس علاقے کے قریب ہی بدھوں کا مشہور و معروف علمی مرکز نالندہ تھا (۱) اور جون پور بھی اس کے قریب ہی واقع تھا جو کسی زمانے میں شرقی بادشاہوں کا پایہ تخت اور علم و دانش کا مرکز تھا اور شاہ جہاں کے عہد میں وسیع علمی مرکز ہونے کی بنا پر اسے دور دراز تک شہرت حاصل تھی، جہاں مسلمانوں کے مختلف علوم و فنون بڑی بالغ نظری سے پڑھائے جاتے تھے، عظیم آباد پٹنہ ان تمام برکات اور اس عہد کی اقتصادی خوش حالی اور ثقافتی ترقی سے متمتع ہو رہا تھا، اس لیے اپنی پیدائش کے وقت بیدل کو جو ماحول نصیب ہوا اس میں انہیں اپنی تربیت و ترقی اور ذہنی و دماغی نشو ونما کا اچھا موقع میسر آیا۔

فوج کی ملازمت اور ورزش بیدل مغل نژاد تھے، ان کے آبا و اجداد کا پیشہ سپہ گری تھا، اپنے چچا میرزا قلندر جن کے سایے میں، والدین کے وفات پا جانے کے بعد انہوں نے پرورش پائی، جواں مردی اور فن سپہ گری میں مہارت کے لحاظ سے بڑے مشہور تھے، صغر سنی ہی سے بیدل نے تربیت جسمانی کی طرف بڑی توجہ صرف کی، شاہ زادہ شجاع کی افواج کے ساتھ جنگ میں حصہ لینے کا موقع بھی ملا اور جب شجاع کی افواج کو اورنگ زیب کے ہاتھوں شکست ہوئی تو ہزیمت کی تمام صعوبتوں سے انہیں بھی دو چار ہونا پڑا، یہ بہادر اور جفاکش مغلوں کا فرزند صحت جسمانی کی خاطر زندگی بھر ورزش کا پابند رہا۔

پٹنہ میں وہ ایک گھوڑے کے ساتھ مقابلے میں دوڑا اور آگے نکل گیا، دہلی میں رہتے ہوئے ایک تنومند گھوڑا کشتی کے لیے پال رکھا تھا اور جن دنوں بیدل شاہ زادہ اعظم شاہ کی فوج میں ملازم تھے، انہوں نے تنِ تنہا ایک شیر کا مقابلہ کیا اور اسے مار گرایا، خود اورنگ زیب، جس کے طویل عہد سلطنت میں بیدل نے زندگی کے کوئی پچاس سال گذارے، بڑا شجاع اور بہادر انسان تھا، اس نے اپنے ایام حکومت میں بہ نفس نفیس پورے آٹھ قلعوں کا محاصرہ کیا اور فتح یاب رہا۔

تصوف اور درویشی کی طرف میلان اپنی اس جسمانی قوت و استعداد کے باوجود بیدل نے

(۱) نالندہ، یہ قدیم ہندوستان کی ایک مشہور درس گاہ تھی جو ٹکشلا کے بعد سب سے مشہور و معروف درس گاہ تھی اور جہاں تعلیم حاصل کرنے کے لیے پوری دنیا سے طالب علم جوق در جوق آتے تھے، یہاں بدھوں کی تعلیم پر خصوصیت سے زیادہ زور دیا جاتا تھا، اس کی تعمیر گپت حکمراں کمار گپتا (۴۱۴-۴۵۵ء) نے کرائی تھی۔

اپنے آبا و اجداد کا پیشہ اختیار نہیں کیا، وہ نہایت ہی مختصر وقت کے لیے فوج میں ملازم رہے اور مستعفی ہو گئے تاکہ درویشانہ زندگی بسر کریں، ایسا کرتے ہوئے ان کے سامنے اپنے والد بزرگوار میرزا عبدالخالق کا نمونہ تھا جو ابتدائے عمر میں گوشہ نشین ہو گئے تھے اور بعد میں ریاضت و مجاہدے کی کثرت کی بنا پر مسند ارشاد پر بھی فائز ہوئے، بیدل کے چچا میرزا قلندر بھی صوفی تھے، اس لیے بچپن ہی سے ایسی فضا میں سانس لینے لگے جس میں تصوف کے اثرات غالب تھے، ان اثرات کو اور بھی زیادہ تقویت حاصل ہوئی جب انہیں ان ارباب تصوف کی خدمت میں رہنے کا شرف حاصل ہوا جو ان دنوں بہار کے علاقے میں اقامت پذیر تھے، تصوف کے زیر اثر بیدل کا رجحان فلسفے اور حکمت کی جانب ہو گیا اور وہ صوفیہ کی صحبتوں میں مابعد الطبیعیات سے متعارف ہوئے اور غزالی، ابن عربی، رومی اور مجدد الف ثانی وغیرہ کے مطالعے سے ان کے خیالات و معلومات میں اضافہ ہوا، فلسفہ و تصوف میں ان کی نظر وسیع ہوئی اور عمر میں اضافے کے ساتھ ساتھ ان کے علم و فکر میں پختگی آتی گئی۔

سیاحت بیدل کی نسلی خصوصیات نے ان کی شخصیت کو حرکی بنا دیا تھا، اگرچہ تصوف ان کا شعار زندگی تھا جو عموماً حرکت کے منافی ہوتا ہے لیکن وہ آزادی کے ساتھ گنگا اور سندھ کے میدان میں پھرا کرتے تھے اور گوشہ نشینی اور عزلت سے متنفر تھے، اپنے چچا اور ماموں کے ساتھ رانی ساگر، آرہ، مہبی، کٹک اور کساری بھی گئے، بہار اور اڑیسہ کو خیرباد کہنے کے بعد پورے بیس سال تک وہ دہلی، اکبرآباد اور متھرا کے درمیان چکر لگاتے رہے اور پنجاب کی سیر کے لیے بھی آئے اور حسن ابدال تک پہنچے، ۱۶۸۵ء/۱۰۹۶ھ کے بعد جب وہ مستقل طور پر دہلی میں رہائش پذیر ہو چکے تھے تو بیراک کی سیر کے لیے گئے، ۷۷ سال کی عمر میں انہوں نے اپنی زندگی کا آخری کا سفر پھر پنجاب کی طرف کیا، متواتر سیر و سفر کی وجہ سے بیدل کو ذاتی طور پر ہر قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑا اور ہر خیال کے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا، بیدل مختلف طبقوں اور متنوع پیشوں کے لوگوں سے ملتے اور گفتگو کرتے تھے، اعلیٰ و ادنی، غریب و امیر، ہندو اور مسلمان غرض ہر قسم کے لوگوں کے ساتھ ان کے گہرے مراسم تھے، جنگ کی صعوبتیں بھی جھیلیں اور ایک عمر تک امن و امان کے ثمر ہائے شیریں سے بھی لذت اندوز ہوئے، اس سے ان کی فکر و نظر میں بڑی وسعت

پیدا ہوئی، ان کے ذہن میں ہر طرح کے معلومات وتصورات کا ذخیرہ جمع ہوگیا، چنانچہ زندگی کے متعلق ان کا دل ہر قسم کے نہایت ہی قیمتی تجربوں کا خزانہ ہوگیا تھا۔

شہرت ومقبولیت جب ۲۱ سال کی عمر میں بیدل نے صوبہ بہار کو الوداع کہا اور دہلی وارد ہوئے تو بالکل غیر معروف اور بے یار و مددگار تھے لیکن ۲۶ سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی دار السلطنت کے اعلیٰ پائے کے لوگوں تک ان کی رسائی ہو چکی تھی اور وہ قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھے جانے لگے تھے، دربار عالم گیری کے دو رکن عاقل خاں رازی اور نواب شکر اللہ خاں اس نوجوان صوفی کا بڑا احترام کرتے تھے اور جب تک زندہ رہے، بیدل کے لیے ان کا جذبۂ احترام بڑھتا ہی چلا گیا، ابھی بیدل فوج میں ملازم نہیں ہوئے تھے اور نہ انہیں کوئی منصب ہی ملا تھا کہ ایک معاصر شاعر ایزد بخش رسا کی ان سے ملاقات ہوئی، رسا نے بیدل کی شخصیت کا اثر ایک ہی لفظ کے ذریعے نہایت ہی عمدگی سے بیان کردیا۔

ہر شخص ان کے گہرے احساس، پر مغز گفتگو اور پر لطف انداز بیان سے بڑا متاثر ہوجایا کرتا تھا، ان کی شخصیت کی جاذبیت میں ان کی سیرت و کردار کو بھی دخل تھا، زندگی بڑی سادگی سے بسر کرتے تھے لیکن خیالات میں رفعت تھی، طبیعت آزاد تھی، جذبۂ لطف و کرم وسیع تھا، ہر شخص ان کی کریمانہ مسکراہٹ سے لطف اندوز ہوا کرتا تھا، ان کی بلند سیرت اور ذاتی جاذبیت کی وجہ سے دہلی میں ان کا گھر ادنیٰ و اعلیٰ، امیر و غریب، مہذب و شائستہ، معمولی اور کم سوجھ بوجھ رکھنے والے غرض تمام لوگوں کے لیے یکساں طور پر کشش کا باعث تھا اور شام کے وقت ہر طبقے اور ہر خیال کے لوگوں کا وہاں مجمع لگ جاتا تھا، ان امور سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیدل کی ذات عوام و خواص کے لیے عقیدت و ارادت مندی کا مرکز بنی ہوئی تھی اور اس لحاظ سے وہ اپنے عہد کی ایک منفرد ہستی تھے، ان کا دل تعصبات سے خالی تھا اور طبیعت فیاض تھی، بہت سے ہندو ان کے شاگرد تھے اور بیدل انہیں بہت عزیز رکھتے تھے اور یہ تعلق یک طرفہ نہیں تھا، ان کے شاگردوں کے دل میں بھی بیدل کے لیے اسی قسم کے مخلصانہ جذبات پائے جاتے تھے، بالخصوص بندرا بن داس خوشگو، سکھ راج سبقت اور آنند رام مخلص ان کا ذکر بڑے ادب و احترام سے کرتے تھے۔

غور و فکر کی عادت بیدل بچپن ہی سے غور و فکر کے عادی تھے، ان کے چچا میرزا قلندر نے انہیں

مکتب سے اٹھا کر اس کام پر لگا دیا کہ گھر بیٹھ کر اساتذہ فارسی کے کلام کا مطالعہ کریں، غور و فکر کی طرف بیدل کا یہ پہلا قدم تھا کیوں کہ ہر شام انہیں اپنے چچا کو دن کے مطالعے کا انتخاب سنانا پڑتا تھا، خوش گو نے لکھا ہے کہ بیدل تمام روز گھر کے اندر رہتے تھے اور غور و فکر میں مستغرق رہ کر اپنے خیالات کو نظم کی صورت میں قلم بند کرتے رہتے تھے۔

لطف ومزاح سے دل چسپی بیدل کی زندگی میں لطف و مزاح کا عنصر بھی تھا، انہیں نغمہ و سرود سے لگاؤ تھا اور کبھی کبھی بربط و نے کے شیریں نغموں سے فردوس گوش کا سامان حاصل کرتے تھے، ایک رقعے میں وہ اپنے ایک دوست میرزا افضائل سے ایک بربط کی فرمائش کرتے نظر آتے ہیں، شام کی مجالس کے لمحات بھی خوش طبعی اور شگفتہ مزاجی کی نذر رہتے تھے، خاص طور پر جب کبھی ان کے شاگرد عطا ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تو بیدل انہیں اپنی تصنیفات میں سے مزاحیہ اشعار اور ہزلیات بڑے ذوق و شوق سے سناتے اور لطف اٹھاتے، ان کی عادت تھی کہ اپنی تحریر کے انداز، تجربے اور فنی باریکیوں کے متعلق جا بجا اشارے کرتے جاتے، شاعر اور شعر کے درمیان جو تعلق ہوتا ہے اسے بیدل ایک مصرعے میں بڑی خوبی کے ساتھ بیان کرتے ہیں، کہتے ہیں ؎

گرہ کشائی سخن ور سخن بود بیدل

فکر واسلوب وہ بچپن میں بہار اور اڑیسہ کے جن صوفیائے کرام کے زیر اثر رہے، ان کی وجہ سے ان کے دل میں صرف جذبۂ تصوف ہی پیدا نہیں ہوا تھا جو بعد میں ان کی تمام نگارشات کا باعث بنا بلکہ ان کی بہ دولت ان کی قوت بیان میں بھی اضافہ ہوا، یہ جذبہ نقطۂ عروج پر اس وقت پہنچا جب دہلی میں رہتے ہوئے، ۱۰۷۶ھ/۱۶۶۵ء میں انہیں شاہ کابل سے ملاقات کرنے کا اتفاق ہوا۔

بیدل نے اپنی پہلی مثنوی "محیط اعظم" ۱۰۷۸ھ/۱۶۶۷ء میں لکھی (۱) اگر ہم اس نظم کا مطالعہ کریں تو نظر آتا ہے کہ شاعر کے چشمۂ حیات میں ہیجان رونما ہو چکا ہے، اس لیے ان کے انداز بیان میں جوش اور توانائی کا وفور ہے، بیدل کے احساسات اور جذبات کی اس کیفیت کا سبب

(۱) فیض بیدل: تالیف ڈاکٹر عبدالغنی مجلس ترقی ادب، کلب روڈ لاہور، پاکستان، ۱۹۸۲ء، ص ۳۲۔

وہ سوال ہے جوانہوں نے اس مثنوی کے مندرجہ ذیل شعر میں کیا ہے:۔

اگر عالم ایں است آدم کجاست؟   اگر ہست آدم بعالم کجاست؟ (۱)

انہیں مستقبل پر تنزل و ادبار کی گھٹا چھائی ہوئی دکھائی دیتی تھی، وہ علما سے ناخوش اور بیزار تھے، کیوں کہ ان کا دل اخلاص اور مذہبی حمیت سے خالی تھے اور وہ اس بات کو دیکھ کر سخت پریشان تھے کہ طبقۂ امرا یعنی حکمراں لوگ بڑے ظالم اور سنگ دل تھے، اس مثنوی میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

زدوران گیتی دلم سادہ نیست   زعدلش عنان عبرتی دادہ نیست

بہ نیرنگ عدلش نظرہا پر آب   زبیداد ظلمش جگرہا کباب (۲)

خوش نمائی اور خود فریبی کا جو ہالہ بچپن کے خوش آیند حالات کی وجہ سے بیدل کے گرد موجود چلا آتا تھا، اب یک قلم کافور ہوگیا، چوں کہ دار الخلافۂ دہلی میں وہ نووارد تھے، اس لیے وہاں کے حالات اور صوبہ بہار کی زندگی کے حالات کے درمیان انہیں واضح تضاد نظر آیا، پستی فطرت اور زبوں حالی کے اس وسیع نظارے نے ان کے دل میں انگیخت پیدا کی کہ وہ اپنے معاشرے کے احیاء کے لیے کوشش کریں، اس لیے زندگی بھر وہ بڑے جوش اور انہماک کے ساتھ کوشاں رہے تاکہ اپنے ہم عصروں کو ہمہ گیر فلسفۂ حیات عطا کریں، اس طرح بیدل کو شاعری کے لیے ایک موضوع مل گیا اور اس موضوع کے ارتقا میں زندگی کے ابتدائی برسوں میں ان کی صوفی کی حیثیت سے تربیت اور ان کے معاصرین کے مایوس کن حالات کا برابر حصہ تھا، اپنا سارا علم اس بات کے لیے وقف کردیا کہ انسان کو کائنات میں اپنا مقام حاصل کرنے کی ترغیب دیں، انہوں نے انسان کو از سر نو دعوت الی الحق دی اور اسے بتایا کہ خدا کے بعد کائنات میں اپنے بے پناہ امکان کار اور قوت عمل کی بنا پر صرف اسی کو اہمیت حاصل ہے، انہوں نے ہر قسم کے دلایل دیے، آیات قرآنی اور احادیث نبوی سے استدلال کیا اور مختلف مسلم اور غیر مسلم مفکرین کے خیالات پیش کر کے انسان کو عقل کے استعمال پر آمادہ کیا، یہ ایک بہت بڑا کام تھا، فی الواقع انہوں نے جو موضوع اختیار کیا تھا، کوئی شاعر اس سے زیادہ بہتر کا تصور نہیں کرسکتا تھا، صوفی کی کیفیت

(۱) بیدل: چہار عنصر، ص ۱۰۲۔ (۲) ایضاً ص ۲۳۔

اور حیثیت سے ان کی تربیت نے انہیں وجدانی تجربات سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنے کی تلقین کی تھی، اس لیے جب انہیں نوع انسانی کو مخاطب کرنا پڑا تو انہوں نے پورے جوش وخروش سے کام لیا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس شاعر نے کس طرح اپنے بہترین موضوع کو اعلیٰ ترین فصاحت کے ساتھ بیان کیا، بیدل کہتے ہیں:۔

اصل معنیست کز تقاضایش   لفظ می بالد و اداہایش

صرف ایک اعلیٰ درجے کا ادیب ہی اسلوب کی حقیقت اور خاص الفاظ کی طرف ایک شاعر کے میلان کا سبب اس عمدگی سے بیان کرسکتا تھا جس کا اظہار بیدل کے اس شعر سے ہوتا ہے، فی الحقیقت اس شعر کے ایک ایک لفظ میں دنیاے معانی پنہاں ہے اور ذرا غور کرنے سے اسلوب کی تمام داستان آنکھوں کے سامنے پھرنے لگ جاتی ہے، الفاظ اور تراکیب کے ارتقا پر یہاں مجملاً غور کرنے سے ہم پر واضح ہوگیا ہے کہ کس طرح بیدل نے فارسی زبان کو ایک قیمتی ذخیرۂ الفاظ عطا کیا، بیدل نے زیادہ تر ان احساسات، جذبات اور خیالات کو بیان کیا جو انہوں نے زندگی کے حقیقی تجربے سے حاصل کیے تھے، اس میں بڑی تازگی و جدت تھی اور انہوں نے اس تجربے کو ایسا اسلوب شاعری اختیار کر کے بیان کیا جو زبان کی شیرینی اور تازگی سے لبریز ہے، موزوں الفاظ کی تلاش میں اکثر و بیشتر بیدل وہ لفظ ڈھونڈ لیتے ہیں جو معلوم ہوتا ہے اسی خیال کے لیے بنا تھا اور پھر اسے اس خوبی سے استعمال کرتے ہیں کہ وہ خیال خود بیدل کی جایداد بن جاتا ہے، اپنی مثنوی ''عرفان'' میں جب بیدل آدمؑ کے جنت سے ہبوط کا ذکر کرتے ہیں تو ان کے قلم سے مندرجہ ذیل شعر نکلتا ہے:۔

چوں دریں تیرہ خاکداں افتاد   آفتابی ز آسمان افتاد

مشاہدے سے تعلق رکھنے والے درخشاں الفاظ کا استعمال بیدل نے یہاں اتنے موثر پیرایے میں کیا ہے کہ یہ خیال ان کی ذاتی ملکیت بن گیا ہے اور استعارہ نہایت برمحل ہے، فی الواقع خیال اور اس کا بیان ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہوتے ہیں، ان کے اس رشتے سے بیدل بہ خوبی واقف ہیں، وہ کہتے ہیں کہ جس طرح رنگ و بو کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا اسی طرح معنی و بیان کا بھی چولی اور دامن کا تعلق ہوتا ہے:۔

زرمز صورت و معنی دل خود جمع کن بیدل　　بہار ایں جاست سامانش دروں بوئی بروں رنگی

بیدل معنی کے بغیر حسن بیان کو لاشہ بے جان تصور کرتے ہیں اور اپنے عہد کے تازہ گو شعرا ایران کا سب سے بڑا اعتراض یہی تھا کہ ان کی شاعری جملہ محاسنِ بیان سے آراستہ و پیراستہ تو ہے مگر معانی سے بالکل خالی ہے، اس لیے اس میں روح اور حرکت موجود نہیں، اسلوب کے اس نظریے کو بیدل نے زندگی بھر سامنے رکھا، موزوں تشبیہات اور مناسب استعارات کا استعمال بھی انہوں نے ہمیشہ اسی نظریے کے مطابق کیا، ان کے اوزان بھی اس عام اصول کے پابند اور بے ساختگی اور فطری پن لیے ہوتے ہیں، یعنی شاعر کے وقتی احساس کا قدرتی لب و لہجہ بن کر صورت پذیر ہوتے ہیں، مثال کے طور پر یہ شعر ملاحظہ ہو:۔

چیست ایں باغ و ایں شگفتنہا　　سر آبی و سیر روغن ہا

بیدل وہ اوزان استعمال کرتے ہیں جو ان کے احساسات کی بوقلمونی کا اظہار کریں، ظاہر ہے ان کے کلام میں جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں، معنی اور صورت ساتھ ساتھ نشو و نما پاتے ہیں، ان کے خیالات جن الفاظ میں ادا ہوتے ہیں، ان کے لیے جن استعارے اور تشبیہ کو استعمال میں لایا جاتا ہے اور جن اوزان کا وہ جامہ اختیار کرتے ہیں، ان کے ساتھ ان کو فطری مناسبت ہوتی ہے، مستقل مزاجی سے اپنے اس جامع نظریۂ اسلوب کی پابندی بیدل کو اس بلند مقام پر فائز کرتی ہے کہ غالب اور اقبال ایسے عالی منزلت شعرا بھی ان کا ذکر کرتے ہوئے ہمہ تن احترام بن جاتے ہیں اور انہیں استادِ کامل تسلیم کرتے ہیں، بیدل کے اندازِ بیان میں زور اور طاقت ہے، اس کے کئی اسباب ہیں، بیدل کے عہد و ماحول، ان کی خاندانی روایات، اور ان کی جرأت ذاتی نے ان کی روح کو بے حد جری بنا ڈالا تھا اور یہی اوصاف قدرتی طور پر ان کے اندازِ بیان میں بھی منتقل ہوگئے ہیں، علاوہ بریں اپنے بیان کو پُرزور بنانے کے لیے بیدل نے صنایع اور بدایع سے بھی کام لیا ہے، بالخصوص اثبات حقیقت کے لیے امیر خسرو اور صائب کے تتبع میں انہوں نے مثالیہ کا استعمال بڑی شد و مد سے کیا ہے، وہ اس مقصد کے لیے الفاظ کی تکرار کو بھی کام میں لاتے ہیں، مثنوی ''طور معرفت'' میں جب وہ کہتے ہیں کہ انسان ایک حل طلب معمہ ہے تو اپنے بیان میں زور پیدا کرنے کے لیے تکرار لفظی سے کام لیتے ہیں:۔

معمائی　　معمائی　　معما　　اگر خواہی کشودن چشم بکشا

اگر ہم بیدل کی نظموں کا ایک ایک کر کے بغور مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ ان کا شاعرانہ الہام یا تو تفکر اور استغراق کا نتیجہ تھا یا ان کی شخصیت پر کسی خارجی شے یا واقعے کا اثر ہوا ہے اور ان کی طبیعت میں اعلیٰ درجے کے فنی عمل کے لیے انگیخت پیدا ہوگئی ہے، لیکن چوں کہ شاعر کی شخصیت میں ہم آہنگی تھی، دونوں صورتوں میں اس کے اصل موضوع میں کوئی تغیر یا تبدل رونما نہ ہوا، پارۂ ماسبق میں مختلف نوعیت کے جو دو محرکات بیان ہوتے ہیں:۔

شب مہتاب ذوق گریہ دارد فیضہا بیدل　　کدا میں بیخبر روغن ندارد از چیں شیری

گر ہمہ برخاک پیچد عشق حسن آرد بروں　　کوشش فرہاد آخر کرد شیریں سنگ را

یہ شعر داخلی عنصر پر زور دیتا ہے، پہلے یہ بات واضح ہو چکی ہوگی کہ بیدل کسی خاص نظریے کے پابند نہیں تھے بلکہ فن کے سلسلے میں خارجی اور داخلی اثرات ہر دو کی اہمیت کے قائل تھے، اصل اور حقیقی احساسات اور جو اس وقت طبیعت پر طاری ہیں، نوکِ قلم سے صفحۂ قرطاس پر آرہے ہیں، احساسات غم کے ہوں یا مسرت کے، ان کے مطابق قدرتی طور پر انہیں درد و کرب یا فرحت و انبساط سے سابقہ پڑتا ہے، جوں جوں نظم پھیلتی ہے، خیالات بھی وسعت پذیر ہوتے چلے جاتے ہیں، مناسب الفاظ اور ترکیبیں بیان کی ضروریات کے مطابق خود بہ خود سامنے آتے چلے جاتے ہیں، خیالات اس کثرت سے امنڈ آتے اور اس قدر غیر محدود ہوتے ہیں کہ الفاظ کی حدود میں نہیں سما سکتے اور بعض اوقات جو قلمی تصویر وہ کھینچنا چاہتے ہیں وہ اس قدر مثالی ہوتی ہے کہ الفاظ کے قالب میں نہیں ڈھل سکتی، چنانچہ بیدل بے تاب ہو جاتے ہیں اور بڑے دردناک لہجے میں پکار اٹھتے ہیں:۔

بیدل بیاد سرو تو در خون تپید لیک　　موزوں نگشت یک الف از مشق آہ او

ان کی آواز دردمند دل سے نکلتی ہے، اس لیے تاثیر میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے:۔

بیدل خونیں جگرم بلبل بے بال و پرم　　نیست در غم کدہ با نالۂ من بے اثری

اور ایک غم گین اور مستمند دل ہی ان کی حقیقت سے آگاہ ہو سکتا ہے:۔

تب و تاب اشک چکیدہ ام کہ رسد بمعنی راز من　　ز شکست شیشۂ دل مگر شنوی حدیث گداز من

یہ اشعار بیدل کے درد و الم کی طرف اشارہ کرتے ہیں، ان کے مطالعے کے بعد یہ تصور کرنا آسان ہے کہ اپنی زندگی کے دوران میں بیدل کو کس قدر جگر فرسا کیفیات کا تختۂ مشق بننا پڑا، ان کا دل عمر بھر واقعی سخت سوز و تپش میں مبتلا رہا، بیدل کی پہلی مثنوی ''محیط اعظم'' ہے جو انہوں نے ۱۰۸۷ھ/۱۶۷۶ء میں لکھی، چوں کہ ان کی یہ اولین طویل نظم تھی، اس کا پلاٹ وحدتِ کاملہ کا مظہر نہیں لیکن جوں جوں مثنوی آگے بڑھتی ہے، جذبے کی یکسانیت اور اتحادِ فکری کی بنا پر خود بہ خود محسوس ہونے لگتا ہے کہ مثنوی اپنے اندر ایک خاموش وحدت رکھتی ہے، انہوں نے اپنی دوسری مثنوی ''طلسم حیرت'' دو سال بعد لکھی، یہ ایک تمثیلی نظم ہے اور اس لیے وحدت و ہم آہنگی کا ایک عمدہ نمونہ ہے، اس میں حرکت، مکالمہ اور حسی تصورات کے ذریعے دل چسپی قایم رکھی گئی ہے، بیدل کی تیسری طویل نظم ''طور معرفت'' ہے جو گیارہویں صدی ہجری کے خاتمے کے قریب لکھی گئی، شاعر نے اس نظم کے اختتام پر کہا ہے:-

خیالی را بہاری نقش بستم

اس کے تار و پود میں باہم پیوستگی پائی جاتی ہے اور اگر چہ یہ ایک واحد سادہ تاثر کا بیان ہے تاہم جو شاہ کار تیار ہوا ہے وہ بڑا پرکار اور تفصیلات سے لبریز ہے، بیدل کی آخری اور طویل ترین نظم ''مثنوی عرفان'' ہے جو ۱۱۲۴ھ/۱۷۱۲ء میں مکمل ہوئی، اس نظم کے لکھنے میں بیدل نے پورے تیس سال لگائے، یہ دو مثنویوں پر مشتمل ہے، ایک ''مرآت اللہ'' جو بالکل مختصر سی ہے اور دوسری خاص ''عرفان''، اول الذکر فلسفیانہ زیادہ ہے اور شاعرانہ کم ہے، یہ نظری امور سے بحث کرتی ہے اور اس کا مقصد فلسفیانہ اور مابعد الطبیعی معلومات بہم پہنچانا ہے، اس میں عمل و حرکت کی گنجایش نہیں اور نہ اس میں توضیحی حکایات ہی موجود ہیں، اگر چہ شاعر نے بعض مقامات پر تخیل سے کام لینے کی کوشش کی ہے لیکن چوں کہ مثنوی کا موضوع تنزلات اور تعینات کا فلسفہ ہے جو انتہا درجے کی مشق فکر کا متقاضی ہے، اس لیے مثنوی کا مطالعہ سخت صبر آزما ہے، تاہم مثنوی میں ہم آہنگی ضرور ہے، لیکن شاعرانہ عنصر اس کی بھینٹ چڑھ گیا ہے، ''عرفان'' بیدل کی سب سے خاص طویل اور بہترین نظم ہے، اس میں کئی دل کش مناظر، غیر فانی، دل چسپی رکھنے والی بہت سی کہانیاں، زندگی اور انفرادیت سے معمور متعدد کردار اور مختلف اقسام شاعری یعنی منظر نگاری، بزم اور رزم

اور فلسفہ و حکمت، بوقلموں فلمی تصاویر کی طرح یکے بعد دیگرے نگاہوں کے سامنے آتے جاتے ہیں، علاوہ بریں انداز بیان بے حد شاعرانہ ہیں، مصنف نے خشک فلسفے سے گریز کیا ہے، معنی و صورت عجیب متوازن طریقے پر جلوہ گر ہیں اور کہیں کہیں تو خیال کی گہرائی اور صفائی، جذبات کے وفور اور الفاظ کے معتدل استعمال کی وجہ سے اندازِ بیان سحر حلال کی کیفیت اختیار کر لیتا ہے، اس نظم میں واقعی شاعر اپنے اوجِ کمال پر دکھائی دیتا ہے اور وہ فردوسی، رومی، نظامی اور دوسرے عظیم شعرا کے ہم پایہ اور برابر نظر آتا جو طویل نظمیں لکھنے میں یدِ طولی رکھتے تھے۔

اگر ہم ایک سرے سے دوسرے سرے تک ان کے کلام کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ ان کے اشعار ان کے فلسفیانہ خیالات میں رنگے ہوئے ہیں، مثنوی ''طور معرفت'' پر غائر نگاہ ڈالنے سے واضح ہو جائے گا کہ انسان کے متعلق عالم اکبر ہونے کا نظریہ کس طرح تمام مثنوی میں ایک مخفی رو کی طرح جاری و ساری ہے، اسی طرح ان کی باقی مثنویات، تمام غزلیات اور ان کے قصاید وغیرہ کا مطالعہ کیا جائے تو ہر جگہ یہی حقیقت کار فرما نظر آتی ہے:-

دل ہر قطرہ گردابیست غواص حقیقت را   تامل در بن ہر موگرہ صد بار می بیند

خیال آشفتگی تحمل اگر شود صرف یک تامل   دل غباری و صد چمن گل نگاہ موری و صد چراغاں

بیدل مسلمانانِ ہند کے عظیم تہذیبی اور ثقافتی ورثے کی پیداوار بھی ہے اور اس کا نمایندہ بھی اس کے وجدان میں اس کا اپنا عہد اپنی پوری پہنائیوں کے ساتھ موجود ہے اور اپنے زمان و مکان سے بالاتر ہو کر وہ مستقبل پر بھی نگاہ ڈالتا ہے اور ان حقایق کو پا لیتا ہے جن تک اکیسویں صدی کے اختتام پر لوگوں کی اب رسائی ہو رہی ہے، بیدل کے فکر و فن کے کئی پہلو ہیں، ایک سے ایک ارفع اور اعلیٰ، اس لیے بیدل کو متعارف کرانے کی ہر کوشش ناکام نظر آتی ہے، بیدل پر ان کا اپنا شعر صادق آتا ہے:-

ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نرفت رنج خمار ما   چہ قیامتی کہ نمی رسی زکنارِ ما بہ کنار ما

بیدل کا دور دورِ غزل تھا اور اس میں انہوں نے خوب جولانی طبع دکھائی، کم و بیش ساٹھ ہزار شعر کہے ہوں گے (۱)، ان کی مثنویات کے نام ''محیط اعظم، طلسم حیرت، طور معرفت، عرفان اور

(۱) مطالعہ بیدل: تالیف تحسین فراقی، پاکستان، مقدمہ، مولف نے یہ علامہ اقبال کے ذاتی نسخہ کے حوالے سے لکھا ہے جسے وہ خود نہ دیکھ سکے مگر ایک قلمی نسخہ جو تحسین صاحب کے ذاتی کتب خانہ میں ہے، اس میں کم و بیش ۳۲ ہزار اشعار ہیں۔

"تنبیہ المھوسین" ہیں، ایک مثنوی گل زرد نایاب ہے (۱)۔

تذکرہ شام غریباں کے مولف لچھمی نراین شفیق لکھتے ہیں، وہ میرزا موصوف کے ساتھ ڈیڑھ سال تک رہے، بنا بریں ان کے تذکرے کا یہ اقتباس خاص توجہ کا مستحق ہے (۲)، میر قدرت اللہ قاسم "مجموعہ نغز" میں انہیں تورانی الاصل کہتے ہیں (۳)، بیدل کا مولد عظیم آباد (پٹنہ) لکھنے والے سب سے پہلے تذکرہ نگار میر غلام علی آزاد بلگرامی ہیں (۴)، محمد شفیع نگینوی نے اکبر نگر، راج محل (بھاگل پور، بہار) لکھا ہے (۵)۔

میرزا عبدالقادر بیدل کی زندگی کے بہت کم حالات اور واقعات ملتے ہیں، خود ان کے عہد میں بعض تذکرے لکھے گئے ہیں جن میں کلمات الشعرا، سرو آزاد خاص طور پر ممتاز ہیں، لیکن ان میں نہایت اختصار سے کام لیا گیا ہے، دیگر پرانے تذکروں میں بھی ان کا ذکر موجود ہے، مثلاً سفینہ خوش گو، نوائے وطن، مجمع النفائس، ریاض الشعرا وغیرہ، لیکن ان سب کے مصنفین سے ہمیں یہی شکایت ہے کہ انہوں نے تحقیق سے کام نہیں لیا اور بالکل متضاد بیانات درج کردیے ہیں اور کہیں وہ میرزا کی زندگی کے نہایت ہی اہم واقعات کو بھی پردۂ خفا سے باہر نہیں لا سکے ہیں، اس بنا پر ان کی مفصل اور حقیقی تاریخ حیات سے واقفیت حاصل کرنا بڑا مشکل ہے۔

بیدل کی تصنیفات میں ایسے اشعار کی بڑی بہتات ہے جن کو ایک ایسا مفکر ہی کہہ سکتا ہے جو نظری امور پر غور کرنے کا عادی ہو، توجہ سے دیکھنے پر یہ امر منکشف ہوجاتا ہے کہ بیدل کے الفاظ کے لیے مسلسل فکری تجربہ پس منظر کا کام دیتا ہے، اگر مثنوی "عرفان" کا افتتاحیہ دیکھا جائے اور اس قصیدے کا مطالعہ کیا جائے جس میں بیدل نے انسان کو مخاطب کیا ہے تو واضح ہوجائے گا کہ بیدل کا خطاب بڑا پر زور ہے اور ساتھ ہی یہ حقیقت بھی الم نشرح ہوجائے گی کہ ان کی فصاحت فکر سے گتھی ہوئی ہے، اس لیے ہم بیدل کے یہاں جس صنف شعر کا بھی مطالعہ کریں، ہمیں اس میں ایک مفکر شاعر پنہاں دکھائی دے گا۔

---

(۱) فیض بیدل: مولف ڈاکٹر عبدالغنی مجلس ترقی لاہور، پاکستان، ص ۱۳۱۔ (۲) رسالہ اردو، کراچی ۱۹۶۹ء، (۳) مجموعہ نغز، مولف میر قدرت اللہ قاسم، مطبوعہ لاہور ۱۹۳۳ء، ص ۱۱۵۔ (۴) سرو آزاد، مولف میر آزاد بلگرامی، مطبوعہ لاہور ۱۹۱۳ء، ص ۱۰۵۔ (۵) یدبیضا، مولف میر آزاد بلگرامی، مطبوعہ لاہور، ۱۹۵۷ء، ص ۲۴۔

"ہربرٹ ریڈ" نے اپنے ایک فاضلانہ مقالے میں بڑی خوبی کے ساتھ یہ نکتہ واضح کیا ہے کہ ان دو کے درمیان کوئی تضاد نہیں پایا جاتا، وہ کہتے ہیں کہ چوں کہ اس قسم کی شاعری عقل کی فتح و کامرانی کا نتیجہ ہوا کرتی ہے جو اسے جملہ علوم اور عملی تجربات کو ایک مربوط نظام فکری عطا کرکے حاصل ہوتی ہے، اس لیے اس میں بڑی توانائی موجود ہوتی ہے، اس نوع کی شاعری ایسے خیالات کو ادا کرتی ہے جن کی اہمیت کا احساس شاعر کے دل میں بڑی شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے، بیدل کی شاعری کے متعلق یہ بنیادی نکتہ ہمیں بتاتا ہے کہ فن کے متعلق ان کا کیا نقطۂ نظر تھا، وہ ان شعرا میں سے نہیں تھے جو صرف فن برائے فن کے قائل ہوتے ہیں، شعر گوئی میں اپنی بے نظیر مہارت وہ کسی اعلیٰ تر مقصد کے حاصل کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے، ایک ایسا مقصد جو فن سے بدرجہا بالاتر تھا، ان ہم عصر شعرا جنہیں اپنی تازہ گوئی پر ناز تھا، صرف بیان کی نزاکتوں کے دلدادہ تھے لیکن بیدل کے سامنے کوئی اور مقصد تھا، وہ کہتے ہیں:

عرض مطلب دیگر و اظہار صنعت دیگر است ‎ ‎ ‎ بیدل از آئینہ نتواں ساخت وضع جام را

وہ چاہتے تھے کہ ان کا فن صرف ان کے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنے، دوسرے الفاظ میں ان کے خیال کے مطابق ابلاغ ہی اسلوب ہے، زندگی میں ان کا ایک مقصد تھا، وہ انسانیت کبریٰ کا احیا چاہتے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ ان کا فن ان کے مقصد رفیع کے تابع ہو، ان کے عہد کے دوسرے شعرا شہنشاہوں اور شاہ زادوں کی مدح گوئی کیا کرتے اور قصاید میں اپنے غیر حقیقی خیالات بیان کیا کرتے تھے لیکن ان کے قلم سے جو مصرع بھی نکلا ان کے خلوصِ دل کی آئینہ داری کرتا تھا، اس لیے وہ اپنے آپ کو مداحِ فطرت کہا کرتے تھے، انہوں نے نہ تو ملوک کی قصیدہ نگاری کی نہ وہ آرٹ کی دیوی کے ہی پجاری بنے، بلکہ انہوں نے اپنی غیر معمولی شاعرانہ صلاحیتیں انسانی فوز و فلاح کے لیے استعمال کیں اور یہ بے نظیر کارنامہ انہوں نے اس عہد میں انجام دیا جب کسی کے دل میں یہ خیال تک موجود نہ تھا کہ آرٹ کو ارفع و اعلا مقاصد کے لیے بھی وقف کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ خوش گو نے اپنی تصنیف "سفینہ خوش گو" میں لکھا ہے اور جناب واحد اپنی تصنیف "اقبال اور ان کا اسلوب اور فلسفہ" میں تحریر کرتے ہیں، یہ بات بیدل کے لیے مایہ افتخار ہے کہ انہوں نے ابن عربی اور اسی قسم کے دوسرے مصنفین کی تجریدی فکر کو نہایت ہی شاعرانہ انداز میں بیان کیا اور اس مقصد کے

لیے اپنے عہد کے تازہ گو شعرا کے حسنِ بیان کو بڑی خوبی کے ساتھ استعمال کیا، اس لیے بیدل کے اسلوب کے متعلق یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس کے کلام میں انتہا درجے کے مربوط نظام فکر کو نہایت ہی حسین پیرائے میں پیش کیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ فارسی ادب میں بیدل نے ایک بڑا سرمایہ چھوڑا تھا، انہوں نے صوفیانہ فکر، فلسفیانہ خیالات اور بیان کی شیرینی کے امتزاج میں ایسی مہارت کا اظہار کیا کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے، اس نقطۂ نگاہ سے بیدل ان شعرائے عالم کی صف میں نظر آتے ہیں جنہوں نے فلسفیانہ خیالات کو انتہا درجے کے شاعرانہ انداز میں بیان کرکے ابدی شہرت حاصل کی۔

حوالے

(۱) مراۃ الخیال، مولف شیر خان لودھی، ص ۳۶۶۔ (۲) خزانہ عامرہ، مولف آزاد بلگرامی، ص ۱۵۲۔ (۳) سفینہ خوش گو، مولف بندرابن داس خوش گو، بحوالہ معارف مئی ۱۹۴۲ء، ص ۳۵۸۔ (۴) تذکرہ بے نظیر، مولف عبدالوہاب افتخار، ص ۳۹۔ (۵) مرآۃ واردات، مولف شاہ محمد شفیع نگینوی۔ (۶) چہار عنصر، مولف بیدل، کلیات صفدری، ص ۶۳۔ (۷) رقعات بیدل، لکھنؤ ایڈیشن، ص ۸۱۔۸۲۔ (۸) برٹش میوزیم لندن کی فہرست مخطوطات فارسی / انگریزی / برگ ۳۷ (الف) ۸۳۸ (ب)۔ (۹) کلمات الشعرا، مولف محمد افضل سرخوش، ص ۳۴۔ (۱۰) نشتر عشق، مولف حسین قلی خاں، پنجاب یونیورسٹی لائبریری، برگ ۲۴۷۔ (۱۱) سفینہ ہندی، مولف بندرابن داس خوش گو، مرتبہ شاہ محمد عطاء الرحمٰن، پٹنہ ۱۹۵۹ء۔ (۱۲) فیض بیدل، مولف ڈاکٹر عبدالغنی، مجلس ترقی ادب کلب روڈ، لاہور، جون ۱۹۸۲ء۔ (۱۳) تصنیفات بیدل، مولف مستشرق مسز ابوسانی، اٹلی۔ (۱۴) فیض قدسی، مولف استاد خلیل اللہ خلیلی، افغانستان۔ (۱۵) نقد بیدل، مولف جناب صلاح الدین سلجوقی، دار التالیف کابل، ۱۳۴۳ھ۔ (۱۶) بیدل شناسی، مولف پروفیسر غلام حسن مجددی۔ (۱۷) سیرت بیدل (انگریزی)، مولف میر محمد آصف انصاری۔ (۱۸) احوال و آثار میرزا عبدالقادر بیدل، مولف میر محمد آصف انصاری۔ (۱۹) قرآن و تصوف، مولف میر ولی الدین۔ (۲۰) معارف النفس، مولف خواجہ عبدالرشید۔ (۲۱) ادبیات اسلامی ہند، ص ۶۲۔ (۲۲) دائرہ معارف اسلامی، ۵/۲۳۱/۲۳۵۔ (۲۳) تاریخ ادب اردو، مولف رام بابو سکسینہ، ۲/۱۴۴۔۱۲۷۔ (۲۴) تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند، ۲/۳۹۳۔۴۰۵۔ (۲۵) فارسی ادب بعہد اورنگ زیب، مولف نور الحسن انصاری، ص ۱۸۰۔۲۲۲۔ (۲۶) میرزا عبدالقادر بیدل حیات اور کلام پر تنقید، مولف سید محمد اصغر۔ (۲۷) میرزا عبدالقادر اور اقبال، مولف تحسین فراقی، پاکستان۔ (۲۸) بیدل، مولف نبی ہادی۔

مصر میں عربی صحافت کا ارتقا

از ڈاکٹر محمد طارق قاسمی☆

مصر میں صحافت کا آغاز فرانسیسیوں کے حملے سے ہوتا ہے، نپولین نے ۱۷۹۸ء میں مصر پر قابض ہونے کے بعد اسے اور دوسرے مشرقی ملکوں کو فرانسیسی تہذیب و تمدن میں رنگ دینا چاہا اس کے لیے اس نے صحافت اور علم و فن کا استعمال کیا، وہ اپنے ساتھ فوج کے علاوہ اہلِ علم کی ایک بڑی جماعت بھی مصر لایا تھا اور وہاں سے دو فرانسیسی جرائد نکالے، ایک تو بالکل اخباری رنگ میں ہوتا تھا جس میں مصر کے اندرونی حالات کا ذکر ہوتا تھا، اسے مصر کی ڈاک کہا جاتا تھا مگر دوسرا علمی رنگ کا تھا، جس میں معاشی، سماجی اور ثقافتی حالات پر تبصرہ ہوتا تھا، یہ دونوں جریدے فرانسیسیوں کی مصر سے واپسی کے ساتھ ہی بند ہوگئے۔

نپولین مصر پر تین سال قابض رہا، اس عرصہ میں اہلِ مصر ان سامراجیوں سے برسرِ پیکار رہے، آزادی کے لیے اس جد و جہد نے ان کے اندر ایک قوت پیدا کردی، نپولین نے مصریوں کو مطمئن کرنے کے لیے ایک مجلس شوریٰ بنائی جو اعیانِ ملک اور تجار کے علاوہ ازہر کے نو علما پر مشتمل تھی، جس سے مصریوں کو ایک مدت کے بعد حکومت میں شرکت کا موقع ملا (۱) مگر ان ساری کوششوں کے باوجود ۱۸۰۱ء میں اس کو مصر چھوڑ کر جانا پڑا اور اسی کے ساتھ ہی یہ دونوں رسائل بھی بند ہوگئے (۲)۔

اس کے علاوہ نپولین نے ایک اخبار عربی زبان میں نکالنے کا حکم دیا تھا جس کا نام "التنبیہ" تھا، اسے بعد میں جنرل (منو) نے اسماعیل الخشاب کی نگرانی میں نکالنے کی کوشش کی مگر عبداللطیف حمزہ کی تحقیق کے بہ موجب یہ اخبار نہیں نکل سکا بلکہ اسماعیل الخشاب کی ایڈیٹر شپ میں "سلسلة التاریخ" نامی اخبار نکلا مگر اس کی حیثیت ایوان کے احوال و کوائف اور اس وقت کے اہم

☆ شعبۂ عربی علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، یوپی، ہند۔

واقعات کے رجسٹر کی تھی (۳)، جرجی زیدان نے پہلے ہی اخبار کا نام ''التنبیه'' بتایا ہے جس کی حیثیت ایک فوجی اخبار یا اوامر ونواہی پر مشتمل رسالے کی تھی (۴)، ادیب مروہ کے خیال میں بھی نپولین نے ۱۸۰۰ء میں ''التنبیه'' نامی ایک عربی اخبار نکالنے کا حکم صادر کیا تھا (۵) اور یہ اخبار برابر نکلتا رہا یہاں تک کہ فرانسیسی مصر چھوڑ کر چلے گئے (۶)، ابوبکر حسنی کے خیال میں ۱۸۰۰ء میں نپولین نے جو اخبار نکالا تھا وہ عربی زبان کا پہلا اخبار اور ''الوقائع المصرية'' دوسرا اخبار ہے جو کہ ۱۸۲۸ء میں نکلا (۷)، بہرحال اس امر میں اختلاف کی گنجائش نہیں کہ پہلے عربی اخبار کے ایڈیٹر اسماعیل الخشاب تھے خواہ وہ کسی بھی نام سے نکلا ہو۔

۱۸۰۱ء کے بعد مصر میں صحافت کا سلسلہ موقوف رہا پھر ۱۸۲۷ء میں محمد علی نے ایک ماہانہ جریدہ ''جورنال الخديو'' نکالا جو نومبر ۱۸۲۸ء میں ''الوقائع المصرية'' کے نام سے جانا جانے لگا اسے حکومت کا ترجمان سمجھا جاتا تھا، یہ جریدہ یورپ کے تعلیم یافتہ (۸) رفاعہ بک رافع الطہطاوی کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا اور برابر سرکاری جریدے کی حیثیت سے اب تک نکلتا رہا، ایک عربی اخبار کی حیثیت سے اس کو پہلا مقام حاصل ہے، یہ جریدہ پہلے صرف ترکی میں پھر عربی و ترکی دونوں میں اور پھر صرف عربی میں نکلنے لگا، اس کے اڈیٹر معروف اہل قلم حضرات رہے، جیسے رفاعہ الطہطاوی جن کا ذکر پہلے آچکا ہے، ان کے علاوہ شیخ حسن عطار، شیخ شہاب الدین، احمد فارس الشدیاق، شیخ احمد عبدالرحیم، شیخ مصطفیٰ سلامہ، صالح مجدی بک، شیخ محمد عبدہ، شیخ عبدالکریم سلمان وغیرہ کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔

عباس اور سعید کے عہد (۱۸۴۹ء سے ۱۸۶۳ء) میں کوئی دوسرا رسالہ نہیں نکلا کیوں کہ ان دونوں کو علم وادب کوئی دل چسپی نہیں تھی، ان کے بعد اسماعیل ۱۸۶۳ء میں تخت نشین ہوا، اس نے فرانس میں تعلیم پائی تھی، اسے عربی زبان وادب سے بڑا لگاؤ تھا، اس کے دور میں صحافتی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا اور اس نے رسائل واخبارات نکالنے کی حوصلہ افزائی کی، اس کی زندگی یورپ میں گزری تھی اور وہ وہاں کے جدید تہذیب وتمدن کا دلدادہ تھا، اپنے ملک میں بھی اسے فروغ دینا چاہتا تھا، اس کی وجہ سے اس کے زمانے میں مصری صحافت مغرب کے نقش قدم پر چل پڑی اور ''الوقائع المصرية'' کے بعد ''اليعسوب'' نامی ماہانہ علمی وطبی رسالہ ۱۸۶۵ء میں محمد علی

پاشا اور ابراہیم الدسوقی نے نکالا (۹)، پھر اسماعیل کے عہد میں مقامی اخبار نکلنا شروع ہوئے جیسے ''وادی النيل'' ۱۸۶۶ء میں نکلا، یہ ایک سیاسی علمی اور ادبی اخبار تھا جو ہفتہ میں دوبار نکلتا تھا، ایک ہفت روزہ ''نزهة الافكار'' ابراہیم مویلحی اور عثمان جلال نے ۱۸۶۹ء میں نکالا جس کا لہجہ سخت تنقیدی تھا یہی وجہ ہے کہ خدیوی اسماعیل نے اس کے بند کرنے کا حکم صادر کردیا (۱۰)، اسی طرح ''روضة الاخبار'' ۱۸۷۰ء میں نکلا، لبنانیوں کا پہلا عربی جریدہ ''السلطة'' تھا اور ہفت روزہ ''الكوكب الشرقي'' جس کی بناء سعید حموی نے رکھی تھی، ۱۸۷۳ء میں نکلا، پھر انہوں نے ایک تجارتی وادبی روزنامہ ''شعاع الكوكب'' نکالا (۱۱)۔

فلپ دی طرازی کے خیال میں اسماعیل کے عہد میں صحافیوں کو کھلی آزادی تھی مگر جرجی زیدان کی تحریروں سے اس کے برعکس معلوم ہوتا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ اسماعیل اپنے ناقدین کو برداشت نہیں کرتا تھا، پس اسی لیے اہل قلم حضرات محتاط رہا کرتے تھے تاہم جو بھی اس کو تنقید کا نشانہ بناتا، اس کو عظیم خطرے سے دوچار ہونا پڑتا جیسا کہ ''الاهرام'' کے ایڈیٹر کے ساتھ واقعہ پیش آیا (۱۲)، اس کا شمار چند اہم اخبارات میں ہوتا ہے، جس کو سلیم وبشارۃ تقلا نے اسکندریہ سے ۱۸۷۶ء میں نکالا تھا (۱۳) اور یہ اہل شام کا سب سے پرانا اخبار ہے بعد میں یہ قاہرہ سے شائع ہونے لگا، اسی طرح شام کے ادبا نے صحافت کے علاوہ بعض ثقافتی امور میں بھی حصہ لیا۔

۱۸۷۷ء میں ''حقيقة الاخبار'' شائع ہوا اور قبطی جریدہ ''مصر'' ۱۸۹۵ء میں نکلا اور سلیم النقاشی اور ادیب اسحاق ''المحروسة'' نامی اخبار اسکندریہ سے ۱۸۸۰ء میں نکالا، جس کو سید جمال الدین الافغانی اور شیخ محمد عبدہ کا قلمی تعاون حاصل تھا (۱۴)۔

صحافت کو اسماعیل کے عہد میں بڑا فروغ حاصل ہوا اور عربی نثر سجع وتکلف کے بندھنوں کو توڑ کر سلاست اور سہل پسندی کی راہ پر گامزن ہوئی، روزمرہ کی زندگی میں پیش آمدہ مسائل کو اخباروں نے اپنے کالموں کی زینت بنایا، اسماعیل کے عہد میں صحافت کے ارتقا کا تذکرہ کرتے ہوئے قسطاکی الیاس عطارہ نے لکھا ہے:-

''حکومت ہر طرح سے اخبارات ورسائل کا تعاون کرتی تھی اور سینکڑوں نسخے خود لے لیتی تھی، اس کے عمال اخباروں کے تعاون کے لیے امرا، رؤسا اور کسانوں سے جبراً جو بدل

اشتراک وصول کرتے تھے اس سے ان کو منع نہیں کرتی تھی جب کہ ان اخبارات ورسائل کو ودنا خواندہ ہونے کی وجہ سے کھول کر پڑھ بھی نہیں سکتے تھے پھر ان میں یہ رجحان پیدا ہوا کہ اہل علم اور خواندہ لوگوں سے انہیں پڑھوا کر سن لیتے تھے (۱۵)۔

اور جب توفیق تخت نشین ہوا تو وطنی اور قومی جذبات ابھر کر سامنے آنے لگے اور "التنکیب" "التبکیت" "الطائف" اور "المفید" جیسے انقلابی اخبارات ورسائل نکلنا شروع ہوئے، اس کی وجہ سے حکومت کو تردد اور تشویش لاحق ہوئی اور اس نے صحافت پر قدغن لگانا شروع کیا، ۱۸۸۱ء میں مطبوعات اور پریس پر بھی بندش ہونے لگی، لیکن انقلاب اپنی راہ لے چکا تھا جس کا اختتام برطانوی تسلط سے ہوتا ہے۔

جس طرح سے عباسیوں نے شعراء، ادبا اور اہل علم کی پذیرائی کی اسی طرح ریاض پاشا کے عہد وزارت میں صحافیوں کی دل کھول کر حوصلہ افزائی ہوئی، بلاشبہ اسماعیل کے عہد میں دائرۃ المعارف کو خاطر خواہ مدد دلانے اور ادبا کو اسماعیل سے قریب کرنے میں ریاض پاشا کا اہم رول رہا جیسا کہ قسطا کی الیاس رقم طراز ہیں:۔

"الوقائع المصریۃ" کو جو حکومت کا ترجمان سمجھا جاتا تھا اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور شیخ محمد عبدہ، سعد زغلول، شیخ عبدالکریم سلمان، ابراہیم بک الحلباوی، شیخ محمد خلیل اور سید وفا جیسے اہل علم وقلم کی ایک کمیٹی تشکیل دی اور ان کو مفاد عامہ کی غرض سے غیر سرکاری کالموں کے تحت لکھنے کو کہا گیا" (۱۶)۔

جمال الدین الافغانی نے اپنے تلمیذ رشید شیخ محمد عبدہ کے اشتراک سے پیرس سے ۱۸۸۴ء میں "العروۃ الوثقی" نکالا اور یعقوب حروف، فارس نمر اور شاہین مکاریوس نے ۱۸۸۹ء میں ہفت روزہ اخبار "المعظم" نکالا، اس اخبار کا مقصد انگریزی سیاست کی تائید تھی (۱۷)۔

ابراہیم المویلحی نے ۱۸۹۸ء میں ایک علمی وادبی ہفت روزہ "مصباح الشرق" نکالا اور ابراہیم نے اسلام کی سرکردہ شخصیات پر خامہ فرسائی کی اور عالم اسلام کے اتحاد پر زور دیا (۱۸) اور شیخ علی یوسف وشیخ علی ماضی نے ۱۸۸۹ء میں ہفت روزہ اخبار "المؤید" نکالا جس کا شمار اپنے زمانے میں مصر کے بڑے اخبارات میں ہوتا تھا، ان اسلامی اخبارات ورسائل میں جو ملک اور

مسلمانوں کے حقوق کی لڑائی لڑ رہے تھے، یہ سر فہرست تھا، اس کے قلمی معاونین میں شیخ محمد عبدہ، سعد زغلول، مصطفی کامل اور ابراہیم مویلحی کا نام سر فہرست ہے اور جرجی زیدان نے ۱۸۹۲ء میں مجلہ "الہلال" نکالا، جو اب تک نکل رہا ہے اور لبنانیوں نے ۱۸۹۴ء میں روزنامہ "لسان العرب" نکالا، حکومت عثمانیہ کے اندر اس پر پابندی لگا دی گئی، پھر ان لوگوں نے قاہرہ میں ہفت روزہ اخبار کی شکل میں نکالا اور ۱۸۹۹ء میں اس اخبار کے سب سے پہلے مالک نجیب حداد کی وفات کے ساتھ اس کا نکلنا بھی بند ہو گیا، ۱۸۹۴ء میں جریدہ "المشیر" نکلا جو دولت عثمانیہ پر تنقید سے بھی گریز نہیں کرتا تھا۔

مصری صحافت کو لارڈ کرومر کے عہد میں فکری آزادی ملی کیوں کہ اس کے خیال میں کھولتے ہوئے برتن کو اگر ڈاٹ لگا کر بالکل بند کر دیا جائے تو پھٹ جائے گا اور اگر بھاپ کو بالکل آزاد چھوڑ دیا تو برتن صحیح وسالم محفوظ رہے گا (۱۹)۔

اور جب انگریز مصر پر قابض ہو گئے تو مختلف النوع مسائل نے جنم لینا شروع کیا جیسے غلامی اور آزادی کی کشمکش اور مصریوں و باب عالی کے مسائل، پس صحافت مختلف دھڑوں میں منقسم ہو گئی، بعض لوگوں نے دولت عثمانیہ کا ساتھ دیا، بعض نے انگریزوں کے مقابلے فرانسیسیوں کو سراہا اور کچھ لوگوں نے انگریزوں کے گیت گائے، اس سے اخبارات ورسائل کی تعداد بڑھنے لگی اور انیسویں صدی کے آخری دس سالوں میں صحافت نے بہت ترقی کیا اور مصر میں اخبارات ورسائل کی ایک بڑی تعداد ہو گئی۔

مراجع

(۱) جدید عربی ادب کا ارتقا، ڈاکٹر سید احتشام ندوی، چارکمان حیدرآباد، ص۱۴ (۲) تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ لجرجی زیدان مع تعلیق شوقی ضیف، ج۴، دار الہلال القاہرہ، ص۵۱ (۳) ادب المقالۃ الصحیفۃ فی مصر لعبد اللطیف حمزہ، الطبعۃ الثانیۃ، ج۱، دار الفکر العربی القاہرہ، ۱۹۵۸، ص۵۴ (۴) تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ لجرجی زیدان، ج۴، ص۵۲ (۵) اور بعض نے اس کا نام "الحوادث الیومیۃ" یا "الوقائع الیومیۃ" بتایا ہے

(۶) الصحافة العربية نشا نتها و تطورها لادیب مروة، دارمکتبة الحیاة بیروت، ۱۹۶۱ء ص ۱۳۸۔۱۳۹ (۷) البعث الاسلامی مایو ۱۹۷۱ (الصحافة العربية فی مختلف ادوارها مقال ابی بکر الحسنی) ص ۶۳ (۸) تاریخ تکوین الصحف المصریة لقسطاکی الیاس عطارہ، مطبعة التقدیم بالاسکندریة ۱۹۲۸، ص ۹۹ (۹) تاریخ آداب اللغة العربية لجرجی زیدان، ج ۴، ص ۵۴ (۱۰) الصحافة العربية نشا نتها و تطورها لادیب مروة، ص ۱۹۲ (۱۱) البعث الاسلامی مایو ۱۹۷۱، ص ۶۴ (۱۲) تاریخ الصحافة العربیه للفیکرنت فلیب دی طرازی، ج ۳، المطبعة الادبیة بیروت، ۱۹۱۴، ص ۵ (۱۳) عبداللطیف حمزہ کے خیال میں ۱۸۷۵ء میں اس کو پرمٹ مل گئی تھی، ادب المقالة الصحیفة، ج ۱، ص ۲۶ (۱۴) الصحافة العربية نشا نتها و تطورها، ص ۱۹۵ (۱۵) تاریخ تکوین الصحف المصریة لقسطاکی الیاس، ص ۱۱۰ (۱۶) نفس المصدر، ص ۱۲۲ (۱۷) الصحافة العربية نشا نتها و تطورها، ص ۱۹۶ (۱۸) مصر کی عربی صحافت، محسن عثمانی، دہلی ۱۹۸۹ء، ص ۲۵ (۱۹) الصحافة العربية نشا نتها و تطورها، ص ۲۰۴۔

تبرکات کا ثبوت

از مولانا محمد سعید مجددی ☆

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد عرصہ دراز تک بنی اسرائیل کے حالات نہایت بہتر رہے، لیکن چند صدیوں کے بعد جب وہ احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی کرنے لگے اور تورات پر عمل کرنا چھوڑ دیا تو ان کی شان و شوکت جاتی رہی، خیر و برکت کا خاتمہ ہوگیا اور سیاسی حالت بھی بہت ابتر ہوگئی یہاں تک کہ پیغمبرِ خدا حضرت شموئیل علیہ السلام کے زمانے میں ان پر ایک کافر بادشاہ جالوت نے تسلط پاکر ان کو شہر سے نکال دیا اور ان کے بہت سے آدمی پکڑ کر لے گیا، قتل و خوں ریزی کے علاوہ خدا کا صندوق (تابوت سکینہ) بھی ان سے چھن گیا، اس مصیبت سے نجات پانے کے لیے وہ بیت المقدس میں جمع ہوئے اور حضرت شموئیلؑ سے درخواست کی کہ آپ ہمارے لیے کوئی امیر مقرر کردیجیے جس کے زیر سرکردگی ہم اللہ کی راہ میں جہاد کریں، نبی وقت نے فرمایا "کہیں ایسا تو نہیں کہ اگر تم پر جہاد فرض کردیا جائے تو تم نہ جہاد کرو، وہ بولے کہ بھلا ہم اللہ کی راہ میں کیوں جہاد نہ کریں گے جب کہ ہم اپنے گھروں اور اپنی اولاد سے نکال دیے گئے ہیں، پھر جب ان پر جہاد فرض کردیا گیا تو سوائے تھوڑے لوگوں کے سب پھر گئے اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے" (بقرہ: ۲۴۶)۔

بنی اسرائیل کی درخواست پر اللہ تعالیٰ نے طالوت کو ان کا امیر مقرر کردیا جو کوئی خاندانی رئیس اور مال دار شخص نہ تھے، اس لیے بنی اسرائیل کہنے لگے کہ ان سے زیادہ تو ہم ہی امارت کے مستحق ہیں، ارشاد ربانی ہے:۔

"اور ان سے ان کے نبی نے کہا بے شک اللہ نے تمہارے لیے طالوت کو امیر مقرر کردیا ہے، انہوں نے کہا بھلا اس کی امارت ہمارے اوپر کیسے ہوسکتی ہے، اس سے زیادہ تو امارت کے

☆ ناظم خانقاہ شریف مجددیہ، بھوپال۔

حق دار ہم ہی ہیں، اسے تو مال کی وسعت بھی نہیں دی گئی ہے، نبی نے کہا بے شک اللہ نے ان کو تم پر منتخب فرمایا ہے اور انہیں علم و جسم میں زیادہ کشادگی عطا فرمائی ہے اور اللہ اپنا ملک جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ بہت وسعت اور علم والا ہے" (بقرہ: ۲۴۷)۔

• پھر انہوں نے طالوت کی امارت اور سرداری کی نشانی طلب کی تو نبی کی دعا سے اللہ تعالیٰ نے یہ نشانی بھی انہیں دی کہ ان کا بنا ہوا صندوق فرشتوں کی مدد سے آپ سے آپ آگیا جس میں اللہ کی طرف سے سامان تسکین اور آلِ موسیٰ و آلِ ہارون کی یادگاریں اور تبرکات تھے۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (بقرہ: ۲۴۸)

اور ان سے ان کے نبی نے کہا کہ اس کی امارت کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق آجائے گا جس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تسلی بخش سامان اور وہ چیزیں ہیں جو موسیٰ اور ہارون کی اولاد کی چھوڑی ہوئی ہیں، صندوق کو فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے، اس میں تمہارے لیے نشانی ہے اگر تم ایمان رکھنے والے ہو۔

اس نشانی کو دیکھ کر بنی اسرائیل نے طالوت کو اپنا امیر تسلیم کرلیا اور وہ تائید الٰہی اور نصرت خداوندی پر یقین رکھنے والے بلند حوصلہ مسلمانوں کے ایک مختصر لشکر کے ساتھ جالوت سے مقابلے میں فتح یاب ہوئے اور انہوں نے کفار کو شکست دے دی۔

صندوق میں تورات کی الواح کے ٹکڑے اور حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے تبرکات اور استعمالی چیزیں تھیں، بنی اسرائیل جنگوں میں اسے آگے رکھتے تھے اس سے ان کو حوصلہ ملتا تھا اور اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ ان کو فتح عطا کرتے تھے (دیکھیے تفسیر کبیر، خازن، ابوالسعود، معالم التنزیل وجلالین وغیرہ)، یہ گویا تبرکات کے مقدس و بابرکت اور مؤثر و محترم ہونے کا کھلا ہوا قرآنی ثبوت ہے۔

قرآن مجید میں حضرت یوسف علیہ السلام کے کرتے سے حضرت یعقوب علیہ السلام کی آنکھوں میں روشنی واپس آجانے کا ذکر بھی ہے، فرمایا:۔

اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰي وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا (یوسف: ۹۳)

یہ میرا کرتا لے جاؤ اور اسے میرے والد کے چہرے پر ڈال دو (تو) وہ دیکھنے والے ہو جائیں گے۔

آگے پھر ارشاد ہوا:۔

فَلَمَّآ اَنْ جَاۗءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰي وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا (یوسف: ۹۶)

• پس جب خوش خبری دینے والا آگیا تو اس نے کرتا ان کے چہرے پر ڈالا تو پھر سے دیکھنے والے ہوگئے۔

اسی سلسلۂ بیان میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی اس کیفیت کا بھی تذکرہ ہے کہ جب قافلہ مصر سے روانہ ہوا تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا میں یوسف علیہ السلام کی خوش بو پارہا ہوں، اگر تم مجھے بے وقوف نہ سمجھو (یوسف: ۹۴)، یہ واقعہ بھی تبرکات کے ناقابل تردید اور موثر ہونے کا بیّن ثبوت ہے۔

احادیث میں حضور اقدس ﷺ کے موئے مبارک سے شفا حاصل کرنے کا ذکر ملتا ہے، صاحبِ مشکوٰۃ نے صحیح بخاری کے حوالے سے یہ روایت نقل کی ہے:۔

عن عثمان بن عبد الله بن موهب قال ارسلني اهلي الى ام سلمة بقدح من مآء وكان اذا اصاب الانسان عين او شئ بعث اليها مخضبة فاخرجت من شعر رسول الله ﷺ وكانت تمسكه في جلجل من فضة فخضخضته له فشرب منه قال فاطلعت في الجلجل فرأيت شعرات حمراء

حضرت عثمان بن عبد اللہ بن موہب روایت کرتے ہیں کہ مجھ کو میرے گھر والوں نے پانی کا ایک پیالہ دے کر ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کے پاس بھیجا اور جب کسی آدمی کو نظر لگتی تھی یا اور کوئی (بیماری) لاحق ہوتی تھی تو وہ ان کے پاس اپنا برتن بھیجتا تھا اور وہ رسول اللہ ﷺ کے بال نکالتی تھیں جن کو وہ چاندی کے ایک قسم کے برتن میں بند رکھتی تھیں، پھر اس کو (لائے ہوئے پانی بھرے برتن میں) خوب ہلا دیتی تھیں پھر اس میں سے پانی پیا جاتا تھا، (راوی) نے

(مشکوٰۃ کتاب الطب والرقی) کہا میں نے اس خاص برتن میں جھانک کر دیکھا تو کئی لال بال دیکھے۔

حجۃ الوداع میں آنحضرت ﷺ نے حلق کرانے کے بعد اپنے بال لوگوں میں تقسیم کردیے تھے، اس کا ذکر مختلف کتب حدیث میں موجود ہے، ہم صحیح مسلم کتاب الحج سے دو حدیثیں نقل کرتے ہیں:۔

عن انس بن مالك ان رسول الله ﷺ اتى منى فاتى الجمرة فرماها ثم اتى منزله بمنى ونحر ثم قال للحلاق خذ و اشار الى جانبه الايمن ثم الايسر ثم جعل يعطيه الناس

حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ منی میں تشریف لائے پھر جمرہ کے پاس آکر کنکریاں ماریں پھر منی میں اپنی قیام گاہ پر تشریف لائے اور قربانی کی، پھر بال مونڈنے والے سے فرمایا لو اور اپنی داہنی جانب کا اشارہ فرمایا پھر بائیں جانب کا پھر بال لوگوں کو دینے لگے۔

دوسری حدیث بہ روایت ابوبکر یہ ہے۔

قال للحلاق ها و اشار بيده الى جانبه الايمن هكذا فقسم شعره بين من يليه قال ثم اشار الى الحلاق والى جانب الايسر فحلقه فاعطاه ام سليم واما فى رواية ابى كريب قال فبدأ بالشق الايمن فوزعه الشعرة

آپ نے بال کاٹنے والے سے فرمایا لو! اور اپنے دست مبارک سے اپنی سیدھی جانب کا اشارہ فرمایا "یہ" پھر آپ نے اپنے بال قریب میں موجود لوگوں کو تقسیم فرمائے، راوی نے کہا پھر بال کاٹنے والے کو اشارہ کیا اور الٹی طرف کا اشارہ فرمایا تو اس نے اس کو بھی مونڈ دیا، پھر وہ بال آپ نے ام سلیم (۱) کو عطا فرمائے، ابوکریب کی روایت میں ہے انہوں

(۱) یہ حضرت انس کی والدہ تھیں، ان کے والد کا نام مالک تھا جو اسلام نہیں لائے تھے، ان کے انتقال کے بعد حضرت ابوطلحہ سے ام سلیم کا عقد ہوا تھا۔

والشعرتين بين الناس ثم قال بالايسر فصنع مثل ذلك ثم قال هاهنا ابو طلحة فدفعه الى ابى طلحة

نے کہا آپ نے سیدھی طرف سے شروع فرمایا پھر ایک دو بال لوگوں میں تقسیم فرمائے، پھر الٹی طرف کے بال مونڈنے کے لیے کہا تو بال کاٹنے والے نے ویسا ہی کیا، پھر آپ نے فرمایا کہ ابوطلحہ یہاں ہیں، پس انہیں بھی بال دے دیے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے اپنے موئے مبارک لوگوں میں تقسیم فرمائے تھے، جن میں ایک خاتون کو بھی دیا تھا، صحیح مسلم میں اس مضمون کی مزید دو حدیثیں ہیں، علاوہ ازیں سنن ابی داؤد اور جامع ترمذی میں بھی الفاظ کی کچھ کمی بیشی کے ساتھ اس مفہوم کی حدیثیں آئی ہیں، شارح مسلم امام نووی اپنی شرح میں احادیث سے مستنبط احکام وفوائد اور مسائل بھی بیان کرتے ہیں، اس حدیث کے فوائد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

ومنها التبرك بشعره ﷺ و جواز اقتنائه للتبرك ومنها مواساة الامام والكبير بين اصحابه واتباعه فيما يفرقه عليهم من عطاء و هدية و نحوها والله اعلم

اور اس میں آپ کے بالوں سے برکت حاصل کرنے کی بات بھی ظاہر ہوتی ہے اور تبرک کے لیے ان کو حاصل کرکے رکھنے کا جواز ثابت ہوتا ہے اور اس میں امام اور بزرگ ہستی کا عطیہ اور ہدیہ وغیرہ تقسیم کرنے میں اپنے اصحاب اور اتباع میں سب کا لحاظ کرنا اور دل جوئی کرنا ثابت ہوتا ہے، واللہ اعلم۔

ان احادیث کی شرح میں دیگر علما وشارحین حدیث نے بھی اسی قسم کی باتیں لکھی ہیں۔

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم ۔ چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

سب سے اول درجے کے تبرکات میں انبیا علیہم السلام کی چیزیں ہوتی ہیں، پھر اسی ضمن میں اولیاء اللہ، علمائے دین، صلحائے امت اور خاصانِ خدا کی چیزیں آجاتی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنی محبت، اپنی اطاعت وعبادت اور اپنے حکم پر تسلیم ورضا کے صلہ میں متبرک اور پرتاثیر فرمادیتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰہَ یَفْعَلُ مَا یُرِیْدُ (الحج:۱۴) بے شک اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔

علی گڑھ کے سفر کی جسمانی وعلمی فتوحات

از مولانا وارث ریاضی فاضل دیوبند☆

جنوری، فروری ۲۰۰۳ء کی ''سیت لہر'' میں میری طبیعت زیادہ خراب رہی، وجع المفاصل نے چلنے پھرنے سے مجبور کردیا تھا، مقامی ڈاکٹروں کے علاج سے خاطر خواہ فایدہ نہیں ہوا تو علی گڑھ جانا پڑا، وہاں ۲۶؍فروری ۲۰۰۳ء سے ۱۹؍مارچ تک قیام کرنا پڑا، حضرت حکیم کلیم اللہ صاحب مدظلہ کے علاج سے افاقہ ہوا، کہا جاتا ہے کہ حکیم صاحب موصوف نے باضابطہ ''علمِ طب'' کی تحصیل نہیں کی ہے، لیکن اپنے والد ماجد مولانا حکیم افہام اللہؒ کی تربیت اور فیض صحبت سے انہوں نے ''طب'' میں اتنی مہارت حاصل کرلی ہے کہ بہت سے لوگ باضابطہ ''علم طب'' کی تحصیل کے بعد بھی اس میں کمال پیدا نہیں کرسکتے، مشہور ہے کہ اگر کوئی حکیم، صالح اور متقی و پرہیزگار ہو تو اسے من جانب اللہ ''دست شفا'' حاصل ہوجاتا ہے، یہ وصف حکیم کلیم اللہ صاحب کو حاصل ہے۔

۱۳؍مارچ کی شب میں پروفیسر مختارالدین احمد آرزو مدظلہ نے کھانے پر مدعو کیا تھا، اس دعوت میں پروفیسر ریاض الرحمن خاں شروانی دامت برکاتہم بھی شریک تھے، اس پُرتکلف دعوت میں کھانے کے دیگر لوازمات کے ساتھ ایک لذیذ میٹھا پکوان بھی تھا، اس پکوان کے بارے میں آرزو صاحب نے فرمایا:۔

''یہ ماقوتی ہے، پٹنہ اور بہار شریف وغیرہ کا پسندیدہ میٹھا پکوان ہے''۔

بہ ذریعہ خط اس پکوان کے بارے میں دریافت کرنے پر آرزو صاحب اپنے ۱۶؍اپریل کے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

''دعوت میں جو میٹھا پکوان آپ کے ملاحظے کے لیے پیش کیا گیا اسے عام طور پر پٹنہ اور

☆ کاشانۂ ادب، سکٹا دیوراج، ڈاک خانہ بسوریا، وایا لوریا، مغربی چمپارن، بہار۔

بہار شریف کے علاقے میں ماقوتی کہتے ہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ یہ وہاں کے باورچیوں کا تلفظ ہے، اصل میں لفظ ''یاقوتی'' ہی ہوگا، کبھی وہاں جانا ہوا تو دریافت کرکے لکھوں گا''۔

یوسف الرحمن بلخی مرحوم کی ''فرہنگ بہار'' میں دیکھوں گا، اسے سب سے پہلے میں نے رسالہ فکر ونظر میں شایع کیا تھا، پھر کتابی شکل میں یہ مضمون کتب خانہ خدا بخش سے شایع ہوا، کچھ ایسے الفاظ اب بھی مل جاتے ہیں جو بہار میں بولے جاتے ہیں اور اس لغت میں مندرج نہیں، کچھ الفاظ بھی تلاش کرکے یک جا کریں تو خوب ہو، کتاب کتب خانہ خدا بخش سے مل سکتی ہے''۔

ممکن ہے مذکورہ پکوان کا نام ''یاقوت'' ہو (یعنی وہ چیز جو غذائیت بخشے) اور مرور ایام نے اسے ماقوتی کردیا ہو، بہ ہرحال وہ میٹھا پکوان بڑا لذیذ تھا اور پہلی بار اسے آرزو صاحب کے دسترخوان پر تناول کرنے کا شرف حاصل ہوا۔

کھانے سے فراغت کے بعد مذکورہ علمی شخصیات کی گل افشانیِ گفتار سے دیر تک لطف اندوز ہوتا رہا، آخر میں آرزو صاحب نے اس ناچیز سے فرمایا کہ شروانی صاحب کو کوئی غزل سناؤ، میں ایک تازہ ترین غزل سنائی جسے ان بزرگوں نے پسند فرمائی۔

تقریباً ۹؍بجے شب میں جب ہم آرزو صاحب کے قصر علم سے رخصت ہونے لگے تو شروانی صاحب اس ناچیز کو ۱۵؍مارچ کو ۱۱½ بجے دن میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے دفتر ''سلطان جہاں منزل'' میں ملاقات کرنے کی ہدایت کرگئے۔

۱۵؍مارچ کو میں وقت مقررہ پر سلطان جہاں منزل پہنچ گیا، شروانی صاحب بڑی شفقت اور محبت سے پیش آئے، دیر تک علمی گفتگو کرتے رہے، ان کی علمی بات چیت اور حسن شفقت سے مجھے پختہ یقین ہوگیا کہ شروانی صاحب اپنے جد امجد نواب صدر یار جنگ حضرت مولانا حبیب الرحمن شروانیؒ کی علمی روایات کے امین ہیں، شرافتِ نفس، خلوص و ایثار، تواضع و انکساری، نفاست اور ذوق لطیف جیسے اوصاف پروفیسر ریاض الرحمن شروانی مدظلہ کو وراثت میں ملے ہیں۔

گفتگو کے دوران میں جناب حفیظ نعمانی صاحب کی تصنیف ''روداد قفس'' پر کاروان ادب (بھوپال) میں شایع شدہ ڈاکٹر صفات علوی صاحب کے مضمون نما تبصرہ کے حوالے سے

شروانی صاحب نے فرمایا:۔

"ڈاکٹر صفات علوی صاحب نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں نے لسانی اور تہذیبی لحاظ سے وہ کارنامہ انجام نہیں دیا جو انہوں نے دوسرے ملکوں میں انجام دیا ہے، ایران میں مسلمان گئے تو وہاں کی زبان اور تہذیب سے اس طرح متاثر ہوئے کہ اللہ کو خدا، صلاۃ کو نماز اور صوم کو روزہ کہنے لگے، حالاں کہ فارسی میں خدا کے معنی مالک اور آقا کے آتے ہیں، ظاہر ہے کہ وحدانیت کا وہ تصور جو لفظ اللہ میں ہے، خدا میں نہیں ہے، اسی طرح فارسی میں نماز کے معنی پرستش اور سیوا وغیرہ کے آتے ہیں لیکن اس پر صلاۃ جیسی مخصوص اسلامی عبادت کا اطلاق ہونے لگا، یہی حال روزہ کا ہے، جس کے معنی برت اور اپاس کے آتے ہیں لیکن صوم کو روزہ کہا جاتا ہے، لیکن ہندوستان میں ایسا نہیں ہوا آخر "اللہ" کو بھگوان، صلاۃ کو پوجا اور صوم کو برت جیسے الفاظ سے تعبیر کرنے میں ہندوستانی مسلمانوں کے لیے کیا مجبوری تھی؟"۔

قدرے توقف کے بعد شروانی صاحب نے سوال مذکور کا جواب بہ ذات خود دینا شروع کیا، شروانی صاحب کا جواب ذہن میں محفوظ ہے لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سوال مذکور کا جواب یہاں شروانی صاحب کے الفاظ میں من و عن نقل کیا جائے، چنانچہ "کاروان ادب" بھوپال میں شایع شدہ شروانی صاحب کے ایک مکتوب کے عکس سے (جسے موصوف نے مجھے ارسال کیا ہے) سوال مذکور کا جواب نقل کیا جاتا ہے:۔

"ایک جواب تو وہ جو علامہ اقبال نے اپنے ترانۂ ہندی میں دیا ہے یعنی:

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے　　اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

اور:　　کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری"

یہاں ظاہر ہے کہ علامہ اقبال یونان و مصر و روما کی تہذیب ہی کے مٹ جانے کا اظہار فرما رہے ہیں اور اس کے مقابلے میں ہندوستانی تہذیب کی برتری کی سراہنا فرما رہے ہیں اور پھر وہ "کچھ بات" جس کی طرف انہوں نے اشارہ کیا ہے اس میں علوی صاحب کے اس سوال کا جواب پوشیدہ ہے، اگر چہ یہ جداگانہ بات ہے کہ بد قسمتی سے آج ہندوستان خود اپنے ہاتھوں اس "کچھ بات" کو مٹانے پر مصر ہے، علوی صاحب کے اس سوال کا ایک دوسرا جواب یہ ہے کہ مصر

اور دوسرے افریقی ممالک میں اسلام عربوں کے توسط سے پہنچا تھا اور ہندوستان میں محمد بن قاسم کے حملے کے بعد وسط ایشیا کے توسط سے آیا، یہ عربی اور عجمی مزاج کا فرق ہے جو اس صورت میں نمایاں ہوا، جہاں فاضل مضمون نگار نے ہندوستانی مسلمانوں کے ناموں اور بعض مذہبی اصطلاحات (مثلاً خدا، نماز، روزہ) کا ذکر کیا ہے وہاں بھی یہی نکتہ ملحوظ نظر رکھنا ضروری ہے، یعنی عرب جن ممالک میں گئے سیکھنے کے لیے گئے، اس کے خلاف جہاں عجمیوں کے قدم پہنچے وہ جذبۂ تفاخر سے سرشار تھے اور بہ جائے سیکھنے کے صرف سکھانا چاہتے تھے"۔

یہاں میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ ہندوستان میں لسانی اور تہذیبی لحاظ سے مسلمانوں کے کارناموں کے جایزہ لینے والوں کو یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ مسلمانوں کے ورود مسعود سے پہلے ہندوستان چھوٹی بڑی سینکڑوں ریاستوں اور مملکتوں میں منقسم تھا، یہ ریاستیں آپس میں ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما رہتی تھیں، تقریباً ہر ریاست کی زبان علاحدہ تھی، اس طرح ہندوستان میں چند ممتاز زبانوں کے علاوہ تین سو سے زاید زبانیں مروج تھیں، مسلمان حکمراں ہندوستان میں آئے تو سب سے اہم یہ کارنامہ انجام دیا کہ ہندوستان کی مختلف ریاستوں اور مملکتوں کو ایک سلطنت میں تبدیل کر دیا اور پشاور سے سورت تک ایک حکومت قایم ہوگئی (نقوش سلیمانی ص ۲۱)۔

جس ملک میں تین سو سے زاید زبانیں رائج ہوں وہاں ایک زبان کو مروج کرنا آسان نہیں تھا، چنانچہ ہندوستان کے مسلم بادشاہوں نے ہندوستان کی سرکاری اور شاہی زبان تو فارسی رکھی لیکن صوبوں کی زبان وہی رہنے دی جو وہاں رائج تھی۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ اپنے مقالہ "ہندوستان میں ہندوستانی" میں رقم طراز ہیں:۔

"...... ہندوستان کی شاہی و سرکاری زبان تو فارسی ہی رہی لیکن ملکی بول چال اور عام زبان کے لیے نہ تو یہ ممکن تھا کہ تمام ہندوستان کی زبان فارسی کر دی جائے اور نہ یہ ممکن تھا کہ ہندوستان کے کسی ایک صوبہ کی زبان اختیار کر کے اس کو پورے ملک پر محیط کر دیا جائے، اس لیے قدرتی طور سے یہ ہوا کہ مسلمان جس صوبہ میں گئے وہاں کی صوبہ وار زبان اختیار کی، ساتھ ہی مذہبی، سیاسی، تمدنی، صنعتی، تجارتی اور علمی ضرورتوں سے اپنی زبان کے سینکڑوں ہزاروں الفاظ اسی طرح اس ملک کی زبان میں مجبوراً بڑھائے جیسے آج ہم انگریزی کے الفاظ و اصطلاحات اختیار کرنے پر مجبور ہیں" (ایضاً ص ۲۶)۔

اس کے بعد حضرت سید صاحب علیہ الرحمہ مذہبی، سیاسی، تمدنی، صنعتی، تجارتی اور علمی ضرورتوں سے متعلق سینکڑوں الفاظ بہ طور مثال پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

"ان مثالوں سے مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں نے جب یہاں قدم رکھا تو اپنے پورے تمدن و معاشرت، ساز و سامان اور اپنی اصطلاحات و ایجادات کو ساتھ لے کر یہاں وارد ہوئے اور ان سب کے لیے نام، اصطلاحات اور الفاظ بھی اپنے ساتھ لائے اور چوں کہ یہ ہندوستان میں بالکل نئی چیزیں تھیں اس لیے ہندوستان کی بولیوں میں ان کے مرادفات کی تلاش بے کار تھی اور وہی الفاظ ہندوستان میں رائج ہو گئے" (ایضاً ص ۳۰)۔

احمد دین لکھتے ہیں:۔

"بہت سے عربی فارسی کے لفظ کثرت استعمال سے اس طرح جگہ پکڑ بیٹھے ہیں کہ ان کی جگہ کوئی سنسکرت یا قدیمی بھاشا کا لفظ ڈھونڈ کر لانا پڑتا ہے مگر اس میں یا تو مطلب اصلی فوت ہو جاتا ہے یا زبان ایسی مشکل ہو جاتی ہے کہ عوام تو کیا خواص ہنود کی سمجھ میں بھی نہیں آتی، مثلاً دلال، فراش، مزدور، وکیل، جلاد، صراف، مسخرہ، نصیحت، لحاف، توشک، چادر، صورت، شکل، چہرہ، طبیعت، مزاج، برف، فاختہ، قمری، کبوتر، بلبل، طوطا، پر، دوات، قلم، سیاہی، جلاب، رقعہ، عینک، صندوق، کرسی، تخت، لگام، رکاب، زین، تنگ، نعل، کوتل، عقیدہ، وفا، درّہ، پردہ، دالان، تہ خانہ، تن خواہ، ملّاح، تازہ، غلط، صحیح، رسد، کاریگر، ترازو، شطرنج کے باب میں تعجب ہے کہ خاص ہند کا ایجاد ہے مگر عرب اور فارس سے جو پھر کر آئی تو سب اجزاء کے نام اور اپنی اصطلاحیں بدل آئی" (سرگذشت الفاظ ص ۱۲۴)۔

"نقوش سلیمانی" اور "سرگذشت الفاظ" کے مذکورہ بالا اقتباسات سے یہ بات ثابت ہو رہی ہے کہ ہندوستان کے مسلم بادشاہوں نے لسانی لحاظ سے قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہے، ظاہر ہے جس ملک میں سینکڑوں مملکتیں اور ریاستیں ہوں اور تین سو سے زیادہ زبانیں مروج ہوں، جہاں سینکڑوں خداؤں کی پرستش کی جارہی ہو جن کے نام بھی علاحدہ علاحدہ ہوں اور بہ قول مولانا شاہ معین الدین ندویؒ:۔

"زمین سے لے کر آسمان تک ہر شے خدا تھی ...... (اور) بہ قول ایک ہندو مورخ

کے خداؤں کی تعداد ہندوستان کی آبادی سے بھی زیادہ بڑھ گئی تھی اور ایک ایک آدمی پر کئی کئی خداؤں کا اوسط پڑتا تھا" (تاریخ اسلام ص ۸)۔

اور جس ملک میں خدا کے لیے بھگوان، پرمیشور، برہم، وشنو، پرس رام، پرماتما اور رام جیسے بے شمار نام ہوں، وہاں اللہ تعالیٰ کے لیے ہندوستان کی زبانوں سے کسی ایک نام کو مروج کرنا تقریباً ناممکن تھا، اسی طرح جس ملک میں پرستش کے لیے مختلف طریقے ہوں وہاں صلات اور صوم جیسی مخصوص اسلامی عبادتوں کی تعبیر ہندوستانی زبانوں کے الفاظ سے کرنا مسلم فرماں رواؤں کے لیے بہت دشوار معاملہ تھا۔

جہاں تک ایران، مصر اور دیگر افریقی ممالک کا معاملہ ہے تو ان ممالک کے حالات ہندوستان سے مختلف تھے، ان ممالک میں اسلام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی قیادت میں پہنچا تھا، صحابہ کی تربیت "درس گاہ نبوی" میں ہوئی تھی، صحبت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دینی، روحانی اور اخلاقی اعتبار سے اسلام کے قالب میں ڈھال کر، ان کو دین و دنیا کی جامعیت کا کامل نمونہ بنا دیا تھا، درس گاہ نبوی کے تربیت یافتہ مسلمان جب ایران اور مصر وغیرہ میں فاتحانہ داخل ہوئے تو ان ممالک کے مذاہب اپنی معنویت کھو چکے تھے، چنانچہ ان مسلمانوں نے اپنی دینی و اخلاقی قوت سے ان ممالک کے تہذیب و تمدن کو یکسر بدل دیا، مسلمانوں کے حسن سلوک سے ان ممالک کی غالب اکثریت حلقہ بہ گوش اسلام ہو گئی، ان مسلمانوں نے اپنے فہم و تدبر، اپنی علمی بصیرت اور اپنے پاکیزہ ذوقِ علم و ادب سے ان ممالک کے زبان و ادب پر بھی گہرے نقوش مرتسم کر دیے، ایک طرف انہوں نے ان ممالک کی زبانوں میں عربی زبان و ادب کے بے شمار الفاظ داخل کیے تو دوسری طرف ان ممالک کی زبانوں کے الفاظ سے بھی اپنی زبان کو بہرہ ور کیا، علاوہ ازیں ان ممالک کی زبانوں کے مروج الفاظ کو بھی نئے مفہوم و معانی عطا کیے، ایران میں ایسا ہی ہوا، چنانچہ خدا، نماز اور روزہ کے وہ مفہوم نہیں رہ گئے جو قبل اسلام ایران میں مراد لیے جاتے تھے، اب خدا کا اطلاق اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس کے لیے ہونے لگا کیوں کہ فارسی میں لفظ خدا "خود آ" سے مرکب ہے، جس کے معنی خود سے آنے والے کے ہیں، چوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے وجود میں کسی کا محتاج نہیں ہے اس لیے اس کی تعبیر خدا سے کی جانے لگی۔

صاحب غیاث اللغات لکھتے ہیں :۔

''گفتہ اند کہ خدا بہ معنی خود آیندہ است ، چہ مرکبیست از کلمہ 'خود و کلمہ' آ کہ صیغۂ امر است از آمدن ، و ظاہر است کہ امر بہ ترکیب اسم معنی اسم فاعل پیدا می کند و چوں حق تعالیٰ بظہور خود بہ دیگرے محتاج نیست بدایں صفت خوانند'' (غیاث اللغات ص ۱۸۵)۔

اسی طرح صلات اور صوم جیسی مخصوص عبادتوں کو نماز اور روزہ سے تعبیر کر کے ان کو وہی مفہوم و معنی عطا کر دیے جو صلات و صوم سے مراد لیے جاتے تھے۔

جہاں تک ہندوستان کے مسلم فرماں رواؤں کے تہذیبی کارنامے کی بات ہے تو اس سلسلے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا اقتدار اس وقت قایم ہوا جب خلافت کے ملوکیت میں تبدیل ہو جانے سے دین و سیاست میں تفریق ہو چکی تھی ، جس کے نتیجے میں مسلم سربراہان سلطنت مطلق العنان ہو کر اسلامی شریعت سے انحراف کرنے لگے تھے ، ملوکیت کے اثرات و نتائج پر روشنی ڈالتے ہوئے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ رقم طراز ہیں :۔

''یہ لوگ (مسلم حکمراں) اپنے اخلاق و اعمال و معاملات میں اسلام کی شرعی سیاست ، اس کے جنگی قانون ، اس کے تمدنی نظام اور اس کی اخلاقی تعلیمات کی بہت کم نمایندگی کرتے تھے ، اس طرح غیر مسلموں کے دلوں سے اسلام کے پیغام کا احترام اور اثر جاتا رہا اور ان کا اعتماد لوگوں سے زایل ہو گیا ، ایک یورپین مورخ کے الفاظ میں ''اسلام کو اس لیے زوال شروع ہوا کہ انسانیت کو ان لوگوں کی صداقت پر شبہ ہونے لگا جو دین جدید کی نمایندگی کر رہے تھے''

(اسلامی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر ، ص ۱۹۱)۔

فیروز تغلقؒ اور نگ زیب عالمگیرؒ کے سوا ہندوستان کے دیگر مسلم بادشاہوں کو اسلام کی پاکیزہ تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت اور اسلامی نظام کے برپا کرنے سے زیادہ عزیز ''ہوسِ اقتدار'' رہی ، ان مسلم فرماں رواؤں کو دین اسلام کی سربلندی اور اسلامی تہذیب کے قیام سے زیادہ حکومت کی توسیع اور اس پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کی فکر دامن گیر رہتی تھی ، اس لیے وہ ہندوستان میں تہذیبی لحاظ سے وہ کارنامہ انجام نہیں دے سکے جو ان کے اسلاف نے ایران ، مصر اور دوسرے افریقی ملکوں میں انجام دیا تھا۔

ڈاکٹر سید عابد حسین مرحوم اپنی تصنیف ''قومی تہذیب کا مسئلہ'' میں ''اسلامی تہذیب اور ہندو تہذیب کا سابقہ'' کے زیر عنوان ہندوستانی بادشاہوں کے تہذیبی لحاظ سے قابل قدر کارنامہ انجام نہ دیے جانے کی وجوہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

''اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کیا وجوہ تھیں جن سے سلطنت دہلی کی اسلامیت محض نام تک محدود رہی اور اتنی حقیقت بھی حاصل نہ کر سکی جتنی عالم اسلام کی دوسری ریاستوں میں پائی جاتی تھی ، سب سے پہلی بات یہ ہے کہ دوسرے ملکوں کی حکومت مسلمانوں کے ہاتھ میں اس وقت آئی تھی جب ان کے دل مذہبی جوش سے معمور تھے ، ہر مسلمان بہ جائے خود ایک مبلغ تھا ، مسلمان فاتحوں کے کسی جگہ قدم رکھنے کے ساتھ ساتھ بلکہ اکثر اس سے بہت پہلے مذہبی تبلیغ کا پُرامن جہاد زور شور سے شروع ہو جاتا تھا ، چوں کہ ان ملکوں کے پرانے مذاہب اپنا اثر کھو چکے تھے ، اس لیے مسلمانوں کی تبلیغی جد و جہد کو فوری کامیابی ہوتی تھی ، تقریباً ساری آبادی مسلمان ہو جاتی تھی اور اسلامی قوانین آسانی سے رائج ہو سکتے تھے ، مگر جس زمانے میں سلطنت دہلی قایم ہوئی مسلمانوں کا خالص دینی جوش ٹھنڈا پڑ چکا تھا ، عام لوگوں میں تبلیغ کا شوق اور صلاحیت باقی نہیں رہی تھی ، سلاطین میں چند مثلاً فیروز تغلق کے سوا کسی کو اشاعت اسلام کی اہمیت کا احساس نہیں تھا ، ظاہر ہے کہ جبر کا طریقہ نہ تو شرع اسلام کی رُو سے جایز تھا اور نہ حالات کے لحاظ سے قابل عمل ، لیکن کسی دوسرے طریقے سے بھی سلطنت نے کوئی قابل ذکر کوشش نہیں کی۔

حضرات صوفیا نے اپنے طور پر اس کام کا بیڑا اٹھایا مگر ان کی راہ میں بڑی مشکلیں حایل تھیں ، ملک کا نہایت وسیع اور زیادہ تر چھوٹے چھوٹے قریوں پر مشتمل ہونا جو بعض علاقوں میں ایک دوسرے سے بہت فاصلے پر واقع تھے ، آمد و رفت کی دشواریاں ، بدامنی ، جنگ و جدل ، اس کے علاوہ ہندو مذہب کی جڑیں مضبوطی سے لوگوں کے دلوں میں قایم تھیں ، اگرچہ مسلمانوں کا معاشرتی نظام جس میں ابھی تک اخوت و مساوات کا کچھ رنگ باقی تھا ، ہندوؤں کے نچلے طبقے کو اپنی طرف کھینچتا تھا لیکن ان کی قدامت پسندی اور وہ وحشت جو اجنبی فاتح قوم سے ہوا کرتی ہے انہیں روکتی تھی ، اونچے طبقے عموماً اپنے مذہب سے مطمئن تھے اور اپنی سماجی حالت سے بھی ، اس میں شک نہیں کہ صوفیوں کی جماعت نے ان ناسازگار حالات میں عام طور پر بغیر حکومت کی مدد

کے محض اپنے جوشِ ایمانی سے تبلیغ کے میدان میں حیرت انگیز کام کیا اور زبردست کامیابی حاصل کی، لاکھوں کروڑوں ہندو جن میں اونچے طبقے کے بھی بہت سے لوگ شامل تھے، مسلمان ہوگئے، پھر بھی مسلمانوں کی تعداد غیر مسلموں کے مقابلے میں اس قدر کم رہی کہ اسلامی ریاست کے لیے یک جہتی اور ہم آہنگی کی جو فضا درکار ہے پیدا نہ ہوسکی۔

اس کے علاوہ جتنے پرانے اور نئے مسلمان ہندوستان میں موجود تھے، خود ان میں بھی ملی وحدت اس حد تک موجود نہیں تھی کہ وہ ریاست کی پالیسی پر کوئی خاص اثر ڈال سکیں اور سلطان کو اسلامی اصول کے مطابق حکومت کرنے پر مجبور کرسکیں'' (قومی تہذیب کا مسئلہ، ص ۲۷و۳۷)۔

ڈاکٹر سید عابد حسین کی کتاب مذکور کے درج بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تہذیبی لحاظ سے اہم کارنامہ انجام دینے کی راہ میں کچھ تو ہندوستان کے ناسازگار حالات حایل رہے اور زیادہ تر مسلمان بادشاہوں کی اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور دین کی سربلندی سے بے اعتنائی سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوئی۔

جہاں تک ہندوستانی مسلمانوں کے ناموں کا معاملہ ہے تو اس سلسلے میں مسلمانوں میں جذبۂ تفاخر کے ساتھ اپنے تشخص کی بقا کا احساس بھی کارفرما رہا، کیوں کہ اسم اپنے مسمّٰی کے لیے علامت کی حیثیت رکھتا ہے۔

معارف مئی ۲۰۰۳ء کا شمارہ موصول ہوچکا ہے، جملہ مندرجات پسند آئے، عراق کی بربادی کے حوالے سے شذرات کی یہ تحریر۔

''زندہ قومیں تخریب ہی میں تعمیر کی راہ ڈھونڈ لیتی ہیں اور اپنی کھوئی ہوئی دولت و قوت دوبارہ اکٹھا کرکے ناموافق حالات کو اپنے موافق بنالیتی ہیں''۔

اپنے اندر بڑی معنویت رکھتی ہے اور زخمی دلوں کے لیے تسلی کا مرہم فراہم کرتی ہے، حضرت جگر مرادآبادی مرحوم بھی کہہ گئے ہیں:۔

یہ صحن و روش، یہ لالہ و گل ہونے دو جو ویراں ہوتے ہیں
تخریب جنوں کے پردے میں تعمیر کے ساماں ہوتے ہیں

اخبار علمیہ

ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد کا آرگن ''اخبار تحقیق''، علمی و تحقیقی سرگرمیوں پر مبنی جدید معلومات سے مزین ہوتا ہے، اس کے اپریل۔ جون ۲۰۰۳ء کے شمارے میں بعض علمی و تحقیقی خبریں شایع ہوئی ہیں، قارئین معارف کی ضیافت طبع کے لیے اس کی خاص خبروں کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے ذریعہ اسلامی علوم کی تبلیغ و ترسیل کا کام نہایت آسان ہوگیا ہے، علم و تحقیق، سائنس و ٹکنالوجی کے ہر شعبہ میں ایسے سافٹ ویئر تیار کیے جاچکے ہیں جو وسیع کتب خانوں کی کمی پوری کررہے ہیں، دائرۃ المعارف انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام وغیرہ کی سی ڈی بنادی گئی ہے، مصری اور سعودی ماہرین سافٹ ویئر کی مشترکہ کوششوں سے قرآن، حدیث، فقہ، تاریخ اسلام، عربی زبان و ادب، سیرت، تراجم اور لغت وغیرہ جیسے اسلامی موضوعات پر تیار کیے گئے مستند سافٹ ویئر کی سی ڈیز انٹرنیٹ پر دستیاب ہیں، قرآن مجید پر بعض سافٹ ویئر کی تفصیلات حسب ذیل ہیں۔

شیخ عبدالرحمن السدیس، سعود الشریم، شیخ محمود خصری، شیخ عبدالرحمن حذیفی، قاری عبد الباسط وغیرہ کی آوازوں میں تلاوت قرآن کی سی ڈی بہ آسانی مل رہی ہے، اس کے علاوہ علم تجوید و قرأت پر متعدد سافٹ ویئر کے نام یہ ہیں، ۱۔ المدخل الی علم القرأت، ۲۔ برنامج یعلم الاطفال تلاوت و تفسیر و معانی کلمات الجزء ۳۰، ۳۔ تعلیم احکام التجوید تحفیظ، ۴۔ البیان (تجوید ۳۰ جزء)، ۵۔ مشاہیر القراء، ۶۔ مکتبۃ القرآن الکریم۔

ایرانی، سعودی، مصری، پاکستانی سافٹ ویئر کمپنیوں نے مختلف زبانوں میں قرآن مجید

کے تراجم کے سافٹ ویئر تیار کیے ہیں، ایرانی اداروں کے تیار کردہ سافٹ ویئر کے نام یہ ہیں، ۱۔تبیان نمبر۱، ۲۔تبیان نمبر۲، ۳۔سلسبیل، ۴۔تنزیل، ۵۔قرآن کی موضوعاتی فہرست تبیان نمبر۳، ۶۔تبیان (انگلش)، ۷۔علیم، ۸۔قدر، ۹۔نور، ۱۰۔کوثر، تراجم وتفاسیر پر بعض سافٹ ویئر کے نام حسب ذیل ہیں۔

۱۔القرآن الکریم، تلاوت قرآن مجید اور آٹھ زبانوں (عربی، فارسی، ترکی، انگریزی، مالیزی، فرانسیسی، اسپینی، اردو) میں ترجمے، ۲۔تلاوت وترجمہ قرآن مجید، ۳۔اردو زبان کے مشہور تراجم وتفاسیر میں بیان القرآن، کنزالایمان، تفہیم القرآن وغیرہ کی سی، ڈی تیار کی جاچکی ہے، ۴۔عبداللہ یوسف پکتھال، مولانا عبدالماجد دریا آبادی وغیرہ کے انگریزی تراجم کی سی ڈی بھی بازار میں مل جاتی ہے، عربی تفسیروں میں، تفسیر ابن کثیر، تفسیر قرطبی، تفسیر جلالین وغیرہ کی سی ڈیز بھی دستیاب ہیں، علوم القرآن سے متعلق متعدد سافٹ ویئرز کے نام یہ ہیں:۔

۱۔مکتبۃ التفسیر وعلوم القرآن، ۲۔مکتبۃ القرآن الکریم، ۳۔اعراب القرآن وغیرہ۔

اسلامی تعلیمات کی تشریح اور مغربی دانش وروں کی طرف سے پھیلائی گئی غلط فہمیوں کے ازالے کے لیے سعودی حکومت نے مغربی یونیورسٹیوں میں اسلامک اسٹڈیز کی چیرز قایم کی ہے، جس کے مقاصد میں مختلف تہذیبوں کے درمیان رابطہ قایم کرنا اور دین اسلام کو تشدد، دہشت گردی اور انتہاپسندی سے عاری طرز حیات کے طور پر پیش کرنا ہے، ان چیرز میں مطالعہ کے لیے سعودی حکومت طلبا کو اسکالرشپ عطا کرتی ہے، کیلیفورنیا یونیورسٹی میں ۱۹۸۴ء میں شاہ عبدالعزیز چیر کی بنیاد اس لیے رکھی گئی ہے کہ اسلام کے بارے میں سائنٹفک مطالعہ وتحقیق کی جائے اور اسلامی تاریخ وورثے کے متعلق متعصبانہ ومعترضانہ تحریروں کے جوابات دیے جائیں، شاہ فہد چیر ہارورڈ یونیورسٹی میں مطالعات اسلامی کے میدان میں سائنٹفک ریسرچ سے فایدہ اٹھانے کے مقصد سے قائم کی گئی ہے، ۱۹۹۳ء میں شاہ فہد نے اس چیر کے لیے پچاس لاکھ امریکی ڈالر کا عطیہ دیا تھا، اس کے علاوہ ۱۹۹۵ء میں لندن یونیورسٹی میں شاہ فہد چیر قائم کی گئی ہے جس کا مقصد مختلف تہذیبوں کے موضوع پر تبادلہ خیال کرنا اور مغربی معاشرے میں اسلام کا تعارف پیش کرنا ہے، اس چیر کے سربراہ انسانی تہذیب پر مسلمانوں کے اثرات اور اسلامی تاریخ کے

موضوع پر لیکچر دینے کے لیے دور دراز کے ملکوں کا سفر بھی کرتے ہیں، اس کے لیے شاہ فہد نے ۱۰ لاکھ پونڈ اسٹرلنگ کی امداد دی ہے۔

الفرقان اسلامک ثقافتی فاؤنڈیشن لندن نے مکہ اور مدینہ کے بارے میں ایک دائرۃ المعارف قائم کرنے کا پروگرام بنایا ہے، ۸۵ کے قریب موضوعات طے کیے جاچکے ہیں، جن میں متعدد موضوع پر مقالات تیار ہوچکے ہیں جو طبع واشاعت کے مرحلے میں ہیں، موضوعات طے کرنے کے لیے سعودی، مصری اور ترکی اہل علم کا بورڈ بنایا گیا ہے۔

۴ر تا ۶ر دسمبر ۲۰۰۳ء کو انگریزی، ترکی اور البانی زبانوں میں بلقان کی اسلامی تہذیب وثقافت اور اس علاقہ کی نامور شخصیات کے فکروفن پر دوسرا بین الاقوامی سمپوزیم منعقد ہورہا ہے، واضح رہے یہ سمپوزیم TIRANA یونیورسٹی میں البانیہ کی اکیڈمی آف سائنسز اور استنبول کے ادارہ برائے اسلامی تاریخ وثقافت اور ترانہ یونیورسٹی کے اشتراک وتعاون سے منعقد ہوگا مزید معلومات کے لیے درج ذیل پتے پر رابطہ کیا جاسکتا ہے، E-Mail: @ Ircica. Org- Fax: 902122584365.

جنوبی کوریا کی راج دھانی سیول میں ماریا بایوٹک انسٹی ٹیوٹ کے سائنس دانوں نے چوہوں کے جسموں میں انسانی جینینی ساق الخلیہ (ایک مخصوص قسم کا خلیہ جو بعض بیماریوں میں پید ہوتا ہے) کو ترقی دینے میں کامیابی حاصل کرلی ہے، اس پروجیکٹ کا نام انہوں نے ہیو۔ ماؤس یعنی انسانی چوہا پروجیکٹ رکھا ہے، اس کے تحت اس بیماری کی نوعیتوں پر قابو پانے کی یہ کوشش بارآور ہورہی ہے، اس پروجیکٹ سے منسلک کم۔ یون یانگ نے بتلایا کہ ہیو۔ ماؤس پروجیکٹ دنیا میں اپنی نوعیت کا پہلا پروجیکٹ ہے، اس سے پہلے اس طرح کا کوئی پروجیکٹ کبھی سامنے نہیں آیا تھا، ان کے مطابق یہ پروجیکٹ انسانی علاج کے منصوبوں کی تکمیل میں مدد کرے گا، طبی سائنس دانوں کو یقین ہے کہ ساق الخلیہ کا مطالعہ کینسر، شوگر جیسی موجودہ لاعلاج بیماریوں اثرات سے محفوظ رہنے اور ان سے متاثر اعضاء کی صحت یابی میں معاون ہوگا۔

(ماخوذ: ٹائمس آف انڈیا)

ک، ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

گچی باؤلی، حیدرآباد

۷؍ جولائی ۲۰۰۳ء

مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کے دو خطوط

(۱)

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے بی اے، بی ایس سی اور بی کام یا کسی بھی سرٹی فکیٹ کورس میں داخلے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ متعلقہ شہر یا علاقے میں یونیورسٹی کا اسٹڈی سنٹر موجود ہو، ہندوستان کے کسی بھی خطے میں مقیم باشندے بہ ذریعہ ڈاک یونیورسٹی ہیڈ کوارٹر (گچی باؤلی، حیدرآباد ـ ۳۲) سے داخلہ فارم منگوا کر داخلہ حاصل کر سکتے ہیں، مختلف علاقوں میں اس سلسلے میں شبہات پائے جاتے ہیں، اس لیے یہ وضاحت ضروری معلوم ہوئی۔

کسی علاقے میں اسٹڈی سنٹر اسی وقت قایم کیا جاتا ہے جب وہاں داخلے کی مطلوبہ تعداد پائی جائے، لیکن اسٹڈی سنٹر نہ ہونے کے باوجود اس علاقے سے داخلے کے خواہش مند امیدوار راست ربط پیدا کر کے داخلے حاصل کر سکتے ہیں، ایسے طلبہ کو یونیورسٹی ان کے مقام سے قریب ترین واقع اسٹڈی سنٹر سے منسلک کر دیتی ہے، جہاں وہ امتحانات میں شریک ہو سکتے ہیں، چوں کہ طالب علموں کے لیے اسٹڈی سنٹرس پر منعقد ہونے والی کونسلنگ کلاسوں میں حاضری لازم نہیں، اس لیے اگر طالب علم کے رہائشی علاقے سے اس کا منسلکہ مقام دور ہے تو وہ کونسلنگ کلاسوں کو نظر انداز کر سکتا ہے، طلبا کو جو کتابیں مہیا کی جاتی ہیں وہ ''خود فہمی و خود وضاحتی'' نوعیت کی ہیں، اس لیے طالب علم از خود انہیں پڑھ کر سمجھ سکتے ہیں، اس کے علاوہ یونیورسٹی کی جانب سے تمام خط و کتابت ہر طالب علم کے دیے گئے پتوں پر راست کی جاتی ہے، داخلے کے

بعد کتابوں کا سیٹ، تفویضات، امتحان سے متعلق اطلاع اور نتایج وغیرہ طالب علم کو انفرادی طور پر ان کے دیے گئے پتوں پر ارسال کیے جاتے ہیں، لہذا کوئی بھی فرد خواہ وہ ہندوستان کے کسی بھی خطے میں رہتا ہو اردو یونیورسٹی کے کورسوں میں داخلہ حاصل کر سکتا ہے۔

دریں اثنا یونیورسٹی میں بی اے، بی ایس سی، بی کام، سال اول اور سرٹی فکیٹ کورس برائے غذا و تغذیہ اور اہلیت اردو بہ ذریعہ انگریزی اور بہ ذریعہ ہندی اور فنکشنل انگلش میں داخلے جاری ہیں، داخلہ فارم ہیڈ کوارٹر کے ساتھ ساتھ تمام اسٹڈی اور ریجنل سنٹروں پر بھی دستیاب ہیں، گریجویشن کورسوں میں 2+10 یا اس کے مساوی امتحان کی بنیاد پر راست داخلے اور سب ہی سرٹی فکیٹ کورسوں میں داخلے کی آخری تاریخ ۴ر اکتوبر ہے۔

(۲)

۸؍ جولائی ۲۰۰۳ء

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی گچی باؤلی، حیدرآباد کا دو سالہ کورس ڈپلوما ان ایجوکیشن (ڈی ایڈ) کیمپس ایجوکیشن کے تحت صرف حیدرآباد میں چلایا جا رہا ہے، یہ کورس فاصلاتی نظامِ تعلیم کے تحت دستیاب نہیں ہے اور نہ ہی ملک کے کسی ادارے کو اس کورس کے لیے فارم فروخت یا وصول کرنے کا مجاز قرار دیا گیا ہے، یونیورسٹی کے رجسٹرار انچارج جناب پی نارائنا کے ایک بیان کے مطابق یونیورسٹی کے علم میں یہ بات آئی ہے کہ بعض غیر مجاز افراد اور ادارے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے ڈی ایڈ کورس میں داخلے کے لیے فارم فروخت اور وصول کر رہے ہیں، یونیورسٹی ایسے اداروں اور افراد کے خلاف قانونی کارروائی پر غور کر رہی ہے، اگر کوئی امیدوار یونیورسٹی کے علاوہ کسی ادارے یا فرد سے کوئی معاملہ کرتا ہے تو یونیورسٹی ہرگز اس کی ذمہ دار نہیں ہے، این سی ٹی ای سے منظور شدہ کورس ڈی ایڈ میں داخلے کے لیے یونیورسٹی کی طرف سے نوٹیفکیشن جاری کیا جاتا ہے اور انٹرنس ٹسٹ کی بنیاد پر ہی محدود تعداد میں داخلے دیے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر ظفر الدین

پبلک ریلیشنز افسر (انچارج)

وفیات

جناب سید ہاشم علی اختر صاحب

افسوس ہے کہ ۱۴؍جون ۲۰۰۳ء کو جناب سید ہاشم علی اختر شکاگو میں وفات پاگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وہ جامعہ عثمانیہ کے مایۂ ناز فرزند، حیدرآباد کے نام ور شخص اور ملک کے بڑے دانش ور تھے، ان کو ملک کی دو شہرۂ آفاق یونیورسٹیوں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہونے کا فخر بھی حاصل ہوا۔

جناب ہاشم علی اختر کی پیدائش ۶؍اکتوبر ۱۹۲۴ء کو حیدرآباد میں ہوئی تھی، شروع کی تعلیم مدرسوں میں ہوئی، ۱۹۳۸ء میں انہوں نے جامعہ عثمانیہ سے بی ایس سی اور ۱۹۴۴ء میں ایم ایس سی کیا، ان کی طبیعت کا رجحان علم و تعلیم کی طرف تھا، اس لیے شروع میں درس و تدریس ہی کے پیشے سے وابستہ ہوئے، پہلے سٹی ہائی اسکول میں مدرس ہوئے پھر سٹی کالج میں جونیئر لکچرر ہوئے، مگر ان میں نظم و نسق کی صلاحیت بھی بہ درجہ اتم تھی، اس لیے جلد ہی انتظامی شعبے سے ان کا تعلق ہوگیا اور ۱۹۴۶ء میں وہ حیدرآباد سیول سروس کے لیے منتخب ہوگئے، اس کے بعد آئی۔اے۔ایس کے لیے ان کا انتخاب ہوا اور ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر تقرر ہوا جس سے ترقی کرتے ہوئے پرنسپل سکریٹری کے عہدے پر فائز ہوئے۔

ہاشم صاحب کو نظم و نسق کا اچھا سلیقہ تھا، ایک کامیاب اور نیک نام آئی۔اے۔ایس آفیسر کی حیثیت سے ان کو بڑی عزت و شہرت ملی، سکریٹریٹ کی اچھی کارکردگی اور خوش انتظامی ہی کی وجہ سے سبک دوش ہونے کے بعد حکومت نے ۱۹۸۲ء میں انہیں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کا وائس چانسلر مقرر کردیا، ابھی اس کی میعاد مکمل نہیں ہوئی تھی کہ ۱۹۸۵ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کے

وائس چانسلر کے لیے ان کا انتخاب ہوگیا۔

وائس چانسلر کی حیثیت سے ان کی کارکردگی بہت اچھی رہی، علی گڑھ میں ان سے پیش تر جناب سید حامد وائس چانسلر تھے جو ایک بحرانی دور تھا لیکن انہوں نے حالات درست کرنے کے لیے اپنی پوری طاقت لگادی، ان کے اصلاحی اقدامات اور عمل جراحی سے فریاد و احتجاج کی آوازیں بھی بلند ہوئیں اور آپریشن کی وجہ سے کراہ اور چیخیں بھی سنائی دیں، ہاشم صاحب اس بہتر اور درست ماحول کو قایم رکھنے میں کامیاب رہے اور جہاں کور کسر اور فاسد مادے رہ گئے تھے ان کو بھی ٹھیک کیا، ان کا دور بڑا پرسکون اور پرامن رہا اور ان سے شاید ہی کسی کو شکایت ہوئی ہو، وہ ایک لایق شخص اور اچھے منتظم تھے، اس لیے ۱۹۸۹ء میں جب اس منصب سے سبک دوش ہوئے تو انہیں مختلف عہدے پیش کیے گئے مگر انہوں نے معذرت کردی۔

گو ان کو انتظامی امور سے زیادہ سروکار رہا تاہم قلم و قرطاس سے بھی ان کا شغل برابر قایم رہتا تھا، وہ اردو اور انگریزی کے اچھے اہل قلم تھے، انگریزی میں بعض کتابیں بھی لکھیں، ان کا مطالعہ وسیع تھا، مطالعہ سے ان کی دل چسپی تاعمر باقی رہی، ہندوستان کے حالات و مسایل سے باخبر رہتے تھے، ان حالات سے مسلمان کس طرح عہدہ برآ ہوں، اردو زبان کا تحفظ و بقا کیسے ہو، مشترکہ قومی تہذیب اور ہندوستان کا سیکولر مزاج کیسے باقی رہے، جدید عہد کے چیلینج کا مقابلہ کس طرح کیا جائے، موجودہ حالات میں اسلام کو پیش کرنے کا کیا سائنٹفک انداز اور اس کی شرح و تعبیر کا کون سا منطقی طریقہ کار اختیار کیا جائے، یہ اور اس طرح کے دوسرے امور و مسایل ہمیشہ ان کے زیر غور رہتے تھے اور ان کے متعلق کبھی کبھی وہ اپنے نتایج فکر قوم کے سامنے پیش بھی کرتے تھے جن سے اختلاف بھی کیا جاتا تھا مگر اس میں غلط فہمیوں کا زیادہ دخل ہوتا تھا، ایک مرتبہ خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری میں اردو رسم الخط کے متعلق کچھ باتیں انہوں نے کہیں تو غلط فہمی کی بنا پر اس کے خلاف بہت کچھ کہا اور لکھا گیا۔

ہاشم صاحب نے کئی ادیبوں اور بعض ارباب سیاست پر مضامین اور خاکے بھی لکھے جن کو پسند کیا گیا، اکثر ان کے خطوط بھی ماہنامہ ''سب رس'' میں شایع ہوتے تھے جن سے ان کے علم و مطالعہ کی وسعت، خیالات کی پختگی، تجربات و مشاہدات کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے، ان

کا علمی وادبی ذوق پختہ اور منجھا ہوا تھا، وہ خاص حیدرآباد کی پیداوار اور پروردہ تھے اس لیے اردو کا
ذوق بہت بلند تھا اور بڑی شگفتہ اور سلیس زبان لکھتے تھے، ان کی تحریر جامع اور پرمغز ہوتی تھی،
ان سے میری پہلی ملاقات دارالعلوم تاج المساجد بھوپال کے علامہ سید سلیمان ندوی سمینار میں
ہوئی تھی، میں اس کے جس سشن میں اپنا مضمون پڑھنے والا تھا، اس میں وہ میرے پاس ہی بیٹھے
ہوئے تھے، میں مقالہ پڑھ کر جب اپنی جگہ پر ان کے پاس بیٹھا تو انہوں نے مقالے کی اور
خاص طور پر اس کی زبان وبیان کی تحسین فرمائی، وہ اس وقت علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر
تھے، مجھ سے فرمایا کہ وہاں آنا ہو تو ملاقات ہونی چاہیے، چنانچہ ان کی موجودگی میں جب علی گڑھ
جاتا تو ان سے ضرور ملتا، پہلی دفعہ اکیلے جانے میں جھجھک ہو رہی تھی تو اپنے خاص کرم فرما مولانا
حافظ محمد تقی امینی مرحوم سابق ناظم سنی دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو لے کر گیا جو وائس چانسلر
صاحب سے بہت بے تکلف تھے، وہ مجھ سے بھی بڑی محبت وشفقت سے پیش آتے اور مختلف
مسایل کے علاوہ دارالمصنفین پر بھی ہمدردانہ گفتگو فرماتے، ان ملاقاتوں سے میرے دل پر ان کی
شرافت، اخلاص، نیکی، لطف وکرم اور حسن خلق کا نقش بیٹھ گیا، وہ طبعاً شریف اور متواضع تھے، کبھی
اپنی بڑائی اور عظمت کا احساس نہ ہونے دیتے، جوبات ان سے کہی جاتی غور وتوجہ سے سنتے، اگر
کرنے کے لائق کام ہوتا تو کردیتے، لیکن اگر ان کے امکان میں نہ ہوتا تو گلی لپٹی باتیں کرنے
کے بہ جائے صفائی سے معذرت کردیتے، اپنی شرافت اور دل نوازی کی وجہ سے حیدرآباد کے علمی
وادبی حلقوں میں بہت مقبول تھے، وہاں کی باوقار مجلسوں میں شریک بھی ہوتے تھے، ان کی
شرکت سے مجلس کی رونق بڑھ جاتی تھی اور جوبات کرتے اس کا وزن محسوس کیا جاتا تھا۔

علمی وادبی اور اردو اداروں سے بھی ان کا تعلق تھا، دارالمصنفین سے بھی ان کو ہمدردی
تھی، حیدرآباد کے مشہور ادارہ ادبیات سے ان کا برابر گہرا تعلق رہا، اس کے بڑے بڑے عہدوں
پر فائز رہے، ۱۹۷۵ء میں اس کے معتمد منتخب ہوئے، ۱۹۸۲ء میں نائب صدر مقرر کیے گئے اور
۱۹۸۹ء میں اس کے صدر منتخب کیے گئے اور ۱۹۹۴ء میں امریکہ جانے سے قبل تک اس عہدے پر
فائز رہے، یہ ادارے کا بڑا سنہرا دور تھا، اس میں اس کے کئی اہم کام انجام پائے، ادارے کے
میوزیم کے لیے حکومت ہند سے گرانٹ ملی جس سے میوزیم کی از سر نو تنظیم میں بڑی مدد ملی، یوم

محمد علی قطب شاہ اور یوم محی الدین قادری زور کی سالانہ تقاریب دھوم دھام سے منائی جاتی تھیں
"سب رس کتاب گھر" کا قیام عمل میں آیا اور ادارے کے مختلف شعبوں کا احیا اسی دور میں ہوا
جس سے اس کی کارکردگی میں بڑا اضافہ ہوا، امریکہ جانے سے قبل ہاشم صاحب نے ایوان اردو
کے بالائی ہال کی تعمیر کے لیے اپنی جیب سے دس ہزار روپے دیے اور کتب خانے کو اپنی پانچ سو
کتابیں بھی مرحمت فرمائیں۔

امریکہ چلے جانے کے بعد گو ادارے سے ان کا ضابطے کا تعلق ختم ہوگیا تھا تاہم
ادارے اور حیدرآباد میں ان کا دل اٹکا ہوا تھا، ہر وقت ان کی یاد تڑپاتی رہتی تھی، خطوط سے اس
کے حالات معلوم کرتے اور حیدرآباد کے لوگوں کی خیریت دریافت کرتے، ادارے کی سرگرمیوں
سے واقف ہوتے اور اس کی ترقی کے لیے اپنے مفید مشورے پیش کرتے رہتے تھے۔

ہاشم صاحب کو حیدرآباد اور اس کی مخصوص تہذیب سے عشق تھا، اسے چھوڑنا گوارا نہیں
تھا مگر اہلیہ محترمہ کی وفات کے بعد بالکل ٹوٹ گئے تھے، یہاں بالکل تنہا رہ گئے تھے اس پر پیری
اور بیماری، مجبوراً شکاگو دو صاحب زادیوں کے پاس چلے گئے، صاحب زادے لاس اینجلس میں
تھے، باپ کی بیماری کی خبر سن کر شکاگو آگئے، ہاشم صاحب کی علالت کا سلسلہ عرصے سے چل رہا تھا
بالآخر وقت موعود آگیا وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ م بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت
کاملہ سے نوازے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔

ڈاکٹر ابن فرید

۸ رمئی ۲۰۰۳ء کو اردو کے ممتاز ادیب ونقاد اور اچھے افسانہ وناول نگار ڈاکٹر ابن فرید کا
انتقال ہوگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ڈاکٹر ابن فرید کا اصل نام محمود مصطفےٰ صدیقی تھا، وہ ضلع بارہ بنکی میں سترکھ کے قریب
کے ایک گاؤں ظفر پور میں ۲۸ راکتوبر ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوئے تھے لیکن ان کی زندگی کا زیادہ حصہ
علی گڑھ میں گزرا، آخر میں رام پور میں متوطن ہوگئے تھے، بیمار ہونے پر علی گڑھ میڈیکل کالج میں

داخل کیے گئے، یہیں پیام اجل آگیا، وہاں سے ان کا جسد خاکی ان کے وطن ظفر پور لایا گیا، ۹؍
مئی کو نماز فجر کے بعد اپنے آبائی قبرستان میں سپرد خاک کردیے گئے۔

ان کے گھر کے حالات بہتر نہیں تھے، ہائی اسکول کرنے کے بعد تعلیم چھوڑ کر رائل
انڈین ایرفورس میں ملازمت کرلی، یہ سلسلہ ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۷ء تک جاری رہا، یافت کے لحاظ
سے ملازمت اچھی تھی مگر ان کو پسند نہیں تھی، وہ اپنی تعلیم جاری رکھنا چاہتے تھے، ٹیوشن سے کام
چلاتے، تعلیم کا شوق انہیں علی گڑھ لے گیا، نفسیات میں داخلہ لیا، اس میں، انگریزی اور عمرانیات
میں ایم۔اے کیا، ۱۹۷۶ء میں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری لی۔

علمی ذوق کی وجہ سے معلمی کے پیشے سے وابستہ ہوئے، مرکزی درس گاہ اسلامی رام پور
سے تدریس کا آغاز کیا، پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ تعلیمات و عمرانیات میں لکچرر ہوئے،
ملک عبدالعزیز یونیورسٹی جدہ میں بھی درس و تدریس کی خدمت پر مامور رہے، ریٹائر ہونے کے
بعد سکوتو یونیورسٹی نائجیریا اور بین الاقوامی یونیورسٹی ملیشیا نے ان کی خدمات حاصل کرنی چاہی مگر
اپنی اور اہلیہ کی صحت کی خرابی کی وجہ سے معذرت کردی۔

مرحوم کا تعلق جماعت اسلامی ہند سے تھا، اس تحریک سے وابستگی کی وجہ سے ان کے
ذہن و دماغ میں اسلامی روح و فکر رچ بس گئی تھی اور تقریباً نصف صدی تک ان کا قلم اسلامی فکر و
رجحان کی ترویج و اشاعت اور جماعت اسلامی کے ادبی محاذ کو قوت اور فیضان پہنچاتا رہا، وہ ادارۂ
ادب اسلامی کے تاسیسی رکن اور ایک مدت تک اس کے صدر رہے، انہوں نے جو کچھ لکھا اس پر
اسلامی افکار و تصورات کی چھاپ رہی، کبھی خدابیزار، خالص مادی، مغرب زدہ اور فحش و عریاں
لٹریچر ان کو اپنی جانب نہیں کھینچ سکا اور نہ وہ اشتراکی کوچہ گردوں کے پھندے میں پھنسے بلکہ ستایش
وصلہ کی تمنا سے بے پروا ہوکر ادب میں طہارت اور پاکیزگی کے تصور کو فروغ دیا۔

ڈاکٹر ابن فرید نے مختلف اصناف ادب میں اپنے نقوش چھوڑے ہیں، بچوں اور خواتین
کا ادب ان کی توجہ کا خاص مرکز رہا ہے، تنقید و تحقیق میں بھی انہوں نے اپنا جوہر دکھایا ہے لیکن ان
کا اصل رجحان افسانہ و ناول نگاری کی طرف تھا، اس میدان میں بڑی لالہ کاری کی ہے، ابھی
حال میں گجرات کے فسادات سے متاثر ہوکر انہوں نے اپنے افسانوں کا ایک مجموعہ ''خوں آشام''

کے نام سے شائع کیا تھا۔

اردو کی طرح انگریزی پر بھی قدرت تھی، دونوں زبانوں میں چھوٹی بڑی درجنوں
کتابیں لکھی ہیں، ان کی بعض اردو کتابوں پر اتر پردیش اردو اکادمی اور میر اکیڈمی لکھنؤ نے ایوارڈ
بھی دیا ہے۔

ابن فرید صاحب کی ادبی خدمت کا ایک میدان صحافت بھی تھا، ان کی ادارت میں
متعدد رسالے نکلے جو اپنے دور کے ممتاز ادبی رسالوں میں شمار کیے جاتے تھے اور جن سے اسلامی
ادبی تحریک کو بڑی توانائی ملی، معیار (میرٹھ) اور [illegible]ش کے شریک مدیر تھے، لیکن نئی نسلیں (لکھنؤ)
اور ادیب (علی گڑھ) کے وہ چیف اڈیٹر تھے، بعض انگریزی رسالوں کی بھی ادارت انہیں سپرد کی
گئی، انڈین جنرل آف سوشل سسٹم کے شریک مدیر تھے اور ۱۹۸۹ء سے ۱۹۹۵ء تک انگریزی
جنرل آف آبجکٹیو اسٹڈیز کے فاؤنڈر اڈیٹر تھے۔

ان کی اہلیہ ام صہیب نے جن کا اصلی نام احمدی خاتون تھا، خواتین کے لیے ماہنامہ
حجاب نکالا، آخری ایام میں ابن فرید صاحب بھی اس کے ادارتی و انتظامی امور میں اپنی اہلیہ کا
ہاتھ بٹاتے تھے، ان کا انتقال ہوگیا تو ابن فرید صاحب نے اسے بند کردیا۔

ادیب کو وہ برسوں بڑی محنت سے ایڈٹ کرتے رہے، یہ جامعہ اردو علی گڑھ کا رسالہ تھا
جس میں اس کے نصاب وغیرہ سے متعلق زیادہ مضامین ہوتے تھے تاہم یہ ادبی نگارشات پر بھی
مشتمل ہوتا تھا، اس کے کئی خاص نمبر بھی شائع ہوئے جن میں ''شبلی نمبر'' بہت اہم اور ایک یادگار
چیز ہے جو حوالے کا کام دیتا ہے، انہوں نے اس کے لیے اس زمانے کے اکثر مشاہیر کے
مضامین حاصل کیے تھے اور خود بھی بہت اچھا مضمون ''شبلی چوں بہ خلوت می روند'' لکھا تھا جو اگرچہ
غیر جانب دارانہ اور معروضی تھا مگر مولانا شبلیؒ کے خاص نکتہ چیں شیخ محمد اکرام جب لاہور سے
ہندوستان آئے اور علی گڑھ گئے تو وہ ابن فرید صاحب سے ملنے ان کی قیام گاہ پر پہنچ گئے اور
مضمون کے بعض نکات کے متعلق بعض وضاحتیں طلب کیں۔

میری ان کی ملاقات اس زمانے کی ہے جب ۱۹۷۸ء میں ہم دونوں اتر پردیش اردو
اکادمی کے ممبر تھے، میری نظر سے ان کے ادبی و تنقیدی مضامین گزرتے تھے، وہ صالح ذہن

رکھنے والے اچھے ادیب، نقاد اور افسانہ نگار تھے، لیکن اس کی وجہ سے اور عام ادبی دھارے اور گروہ بندی سے الگ تھلگ رہنے کی وجہ سے رائج الوقت ادیبوں نے ان سے کوئی خاص اعتنا نہیں کیا، تاہم اپنے حلقہ فکر کے ادیبوں میں مقبول تھے اور اس حلقے میں ان کا ادبی وزن تسلیم کیا جاتا تھا، اب وہ وہاں جاچکے ہیں جہاں صرف اچھے اعمال کا ذخیرہ ہی کام دیتا ہے، اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے اور ان کے اعزہ واحباب کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔

جناب ابوالفیض سحر

اردو کے ایک اور اچھے شاعر و ادیب اور اردو تحریک کے خاموش مگر سرگرم اور مخلص خدمت گزار جناب ابوالفیض سحر ۲۲/جون کی شب میں حرکت قلب بند ہوجانے سے وفات پاگئے اور ۲۳/جون کو ۱۱ بجے دن میں بستی حضرت نظام الدین میں واقع قبرستان میں دہلی کے شعرا وادبا اور متعلقین کی کثیر تعداد کی موجودگی میں سپرد خاک کردیے گئے۔

وہ بالکل ٹھیک تھے، انتقال کے روز نوئیڈا میں جناب رفعت سروش کے گھر ایک تقریب میں شرکت کے لیے گئے تھے، شام کو واپس آئے تو کچھ بے چینی محسوس کی، رات تک طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو اسپتال میں داخل کیے گئے جہاں روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی، ان کی صحت بہتر رہتی تھی مگر اس سے پہلے بھی ایک بار دل کا دورہ پڑ چکا تھا، یہ دوسرا دورہ جان لیوا ثابت ہوا۔

سحر صاحب مارن پیٹ ضلع محبوب نگر (آندھرا پردیش) میں ۱۹/فروری ۱۹۳۷ء کو ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے تھے، محبوب نگر ہائی اسکول کے اردو میڈیم اسکول سے میٹرک کیا، مزید تعلیم کے لیے حیدرآباد گئے، چادر گھاٹ کالج سے انٹر کیا اور کالج میگزین کے اڈیٹر ہوئے، پھر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے آرٹس کالج سے بی۔اے کیا، ٹیوشن سے تعلیمی اخراجات پورا کرتے تھے، بی۔اے کرنے کے بعد حیدرآباد کے ایک قدیم اور مشہور اسکول اشرف المدارس میں ٹیچر ہوگئے مگر جلد ہی یہ ملازمت چھوڑ کر ایم۔اے کرنے کے لیے یونیورسٹی میں داخلہ لیا، مجلّہ عثمانیہ کے اڈیٹر بھی ہوئے، اسی زمانے میں انہیں ماہر لسانیات پروفیسر مسعود حسین خاں سے تلمذ کا فخر حاصل ہوا، جو سحر صاحب کو ان کے اخلاص اور اردو سے دل چسپی کی بنا پر بہت عزیز رکھتے تھے،

باگاریڈی صاحب سے بھی سحر صاحب ان کی اردو دوستی کی وجہ سے بہت قریب ہوگئے تھے، ایم اے کرنے کے بعد سحر صاحب باگاریڈی کے قایم کردہ اردو میڈیم اسکول میں ٹیچر ہوگئے مگر ان کے شفیق استاد مسعود حسین خاں کو ان کی استعداد اور اچھی صلاحیت کی بنا پر یہ ملازمت پسند نہیں تھی، ان کی کوشش سے سحر صاحب کو دلی میں یونین پبلک سروس کمیشن میں اردو مترجم کی جگہ مل گئی، لیکن اردو سے دل چسپی کی بنا پر انہیں خود یہ ملازمت پسند نہیں تھی، چنانچہ جب مرکزی حکومت نے اردو کی ترقی کے لیے ترقی اردو بیورو قایم کیا جو اب قومی کونسل برائے فروغ اردو کہلاتا ہے تو اس میں ملازمت کرلی اور ترقی کرکے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے اور اسی سے سبک دوش ہوئے، اس تقریب سے وہ حیدرآباد چھوڑ کر دلی آئے تو اسی کو اپنا وطن بنالیا اور یہیں کے ہوکر رہ گئے لیکن حیدرآباد بھی آتے جاتے رہتے تھے۔

جناب ابوالفیض کو اردو زبان سے عشق تھا، طالب علمی کے زمانے ہی سے وہ اردو تحریک سے وابستہ رہتے تھے، انجمن ترقی اردو سے والہانہ تعلق تھا، اس کی ہر تقریب اور پروگرام میں شریک ہوتے اور اس کے کاموں میں بہت پیش پیش رہتے، انجمن کے صد سالہ جشن کو کامیاب بنانے میں انہوں نے رات دن ایک کردیا تھا، اس کے آخری جلسے میں شکریے کی رسم بھی ادا کی، انجمن کے ذمہ داروں کے ہر کام میں ان کا ہاتھ بٹانے اور اس سے غیر معمولی خلوص اور دل چسپی کی بنا پر وہ اس کے رکن منتخب کرلیے گئے تھے، میری ان کی ملاقات انجمن کے سمیناروں ہی میں ہوئی تھی۔

ان کی پوری زندگی اردو زبان وادب کی بے لوث خدمت اور ادبی سرگرمیوں میں گزری، وہ اردو کے مختلف اداروں کی خدمت اعزازی طور پر انجام دیتے تھے، ہر کام بڑے خلوص، دل چسپی، خاموشی اور محنت وجاں فشانی سے کرتے تھے، شہرت، مقبولیت اور صلہ وستایش کی تمنا سے بے نیاز ہوکر اسے اپنا فریضہ سمجھتے تھے، طبیعت میں بہت انکسار تھا اس لیے کبھی اس کا فخریہ ذکر کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔

جناب ابوالفیض اردو کے صحافی، مترجم، ادیب اور نقاد تھے، تحقیق وتنقید وتبصرہ میں وہ تعصب اور جانب داری کو پسند نہیں کرتے تھے، ان کا رویہ معقول، حق پسندانہ اور معتدل و متوازن ہوتا تھا، خوش کلام شاعر بھی تھے، نثر نگاری کے کمال سے ان کی شاعری دب گئی تھی،

سرکاری مصروفیت کے باوجود انہوں نے کئی کتابیں لکھیں ، خلا میں پہلا ہندوستانی ، تناظر اور تجزیے ، تیشۂ نظر ، فن اور فنی مباحث اردو دنیا میں مقبول ہوئیں ، ان کے بعض تنقیدی کام مرکز توجہ بنے ، مرحوم ظ ۔ انصاری کے ساتھ مل کر '' خسرو شناسی '' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس کے کئی ایڈیشن نکلے ، وہ برصغیر کے مختلف رسالوں اور اخباروں میں مضامین بھی لکھتے تھے ، تیلگو اور انگریزی زبانوں میں بھی مضامین لکھے ۔

سحر صاحب اچھے مقرر تھے ، زمانۂ طالب علمی ہی سے ان میں تقریر کی اچھی صلاحیت پیدا ہوگئی تھی ، اکثر ادبی جلسوں اور تقریبات میں شریک ہوتے ، سمینار میں مقالے تو پڑھتے ہی ، ان کی نظامت بھی کرتے ، انہوں نے خود بھی کئی بڑے سمینار کرائے ، حیدرآباد جاتے تو ان کے اعزاز میں نشستیں ہوتیں اور وہ تقریر کرتے ۔

اردو کے اکثر ادبا ، شعرا مذہب سے بے تعلق اور بے گانہ ہوتے ہیں ، انہیں قومی و ملی کاموں سے بھی سروکار نہیں ہوتا ، لیکن جناب ابوالفیض سحر صوم و صلاۃ کے پابند تھے ، متعدد سرکاری و نیم سرکاری اداروں سے وابستہ ہونے کے باوجود آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے بھی ممبر تھے اور اس کے پلیٹ فارم سے قومی و ملی مسایل حل کرنے کے لیے فکرمند رہتے تھے ۔

جناب ابوالفیض سحر خلوص و محبت کا پیکر ، ایک شریف ، نیک نفس ، خلیق اور ملنسار انسان تھے ، اپنے دوستوں اور ملنے جلنے والوں کی مدد کے لیے ہر وقت تیار رہتے ، انہیں کبھی شکایت کا موقع نہ دیتے ، کبھی کسی کی دل شکنی نہ کرتے ، ہنسی اور بے تکلفی کی بات بھی کرتے تو دوسروں کے جذبات کا خیال رکھتے اور کوئی تکلیف پہنچانے والی بات نہ کرتے ، ان کی سب سے بڑی خوبی ان کی انکساری تھی ، دوسروں کے ادب و احترام اور عزتِ نفس کے خیال میں مجسم انکسار اور متواضع بن جاتے ، اپنی فضیلت و برتری کا کبھی اظہار نہ کرتے ، ان میں کبر اور گھمنڈ کا شائبہ نہ تھا ، ان کی ذات میں حیدرآباد اور دلی دونوں کی تہذیب و شرافت اور وضع داری جمع ہوگئی تھی ، وہ اپنی پاکیزہ سیرت و شخصیت ، صاف اور بے داغ زندگی کی وجہ سے دلی اور حیدرآباد دونوں جگہ مقبول اور ہر دل عزیز تھے ، اللہ تعالیٰ جنت الفردوس نصیب کرے اور اعزہ و احباب کو صبر و تسلی بخشے ، آمین ۔

'' ض ''

ادبیات

دو غزلہ

غزل (۱)

از جناب وارث ریاضی صاحب ☆

یہ حسنِ کرم ہے مری بے بسی کا   کہ احساں نہیں کوئی مجھ پر کسی کا
رہ غم میں ہر گام پر امتحاں ہے   وقار و تحمل کا سنجیدگی کا
اُسی کو ہے جینے کا حق اس جہاں میں   جسے لطف آتا ہے غم میں خوشی کا
سلامت ہے غم تو سلامت ہے سب کچھ   بھلا ہو الٰہی ! غم زندگی کا
مری جاں ! ترے غم سے یوں ربط دل ہے   تعلق ہے شبنم سے جیسے کلی کا
ہنسی سے تری رشتۂ والہانہ   مرے زخم دل کا ، گلوں کی ہنسی کا
کبھی ربطِ محکم ، کبھی ربطِ نازک   تری بے رخی سے مری بے خودی کا
کبھی لطف آیا وفا کا جفا میں   کبھی دوستی میں مزا دشمنی کا
نہیں ہے مجھے شوق صحرا نوردی   سبب کچھ تو ہے میری دیوانگی کا
نہ ہوگا کبھی اس کے گھر میں اجالا   یقیں جس کو ظلمت پہ ہے روشنی کا

بھرم کھل گیا اس کی محفل میں وارث
تری عقل و دانش ، تری شاعری کا

غزل (۲)

تسلط ہے دنیا میں دانش وری کا   جو علم و ہنر کا ہے ، سب کچھ اسی کا

☆ کاشانۂ ادب ، سکھا (دیوراج) ، ڈاک خانہ بسوریا ، وایا لوریا ، مغربی چمپارن ، بہار

خدا جانے کیوں ہم سے دنیا خفا ہے؟
سمجھ میں نہ آیا سبب برہمی کا

پڑھا ہے سبق تم (۱) نے مکتب میں شاید
عناد و تعصب کا ، غارت گری کا

رعونت تری مار ڈالے گی تجھ کو
برا ہو تری قوتِ عسکری کا

تری تمکنت توڑ دے گا زمانہ
خدا تجھ کو دے گا صِلا سرکشی کا

ترا حال ہوگا برا ماسکو سے
کہ یکساں زمانہ رہا کب ، کسی کا ؟

خدا کے یہاں دیر ہوتی ہے ورنہ
ہوا ہے کب انجام اچھا بدی کا

بہ ظاہر وہ انساں نظر آرہا ہے
مگر کچھ نہیں اس میں گُن آدمی کا

جدھر دیکھیے آج خوں ہورہا ہے
محبت کا اخلاص کا ، راستی کا

اخوت میں انصاف میں ، درگذر میں
نہیں کوئی ہم سر ہمارے نبیؐ کا

مرے فکر و فن پر ہے فیضانِ وارث
جگن ناتھ آزاد کی شاعری کا

(۱) روئے سخن ہے دشمن انسانیت صدر امریکہ جارج ڈبلیو بُش کی طرف جس نے عراق کو تباہ کر کے یہ ثابت کردیا کہ اسے انسانیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ، (وارث)۔

کلیات شبلی (اردو)

از علامہ شبلیؒ

علامہ شبلیؒ ایک قادر الکلام شاعر تھے ، فارسی ہی نہیں ان کی اردو شاعری بھی بلند پایہ ہے ، اردو میں اخلاقی اور تاریخی نظمیں لکھنے کی ابتدا ان ہی نے کی ، یہ ان کی تمام اردو نظموں کا مجموعہ ہے ، جس میں مثنوی ، قصاید اور تمام اخلاقی ، سیاسی ، مذہبی ، قومی اور تاریخی نظمیں شامل ہیں۔

قیمت : ۲۵روپے

مطبوعات جدیدہ

EPISTLES (مکتوبات امام ربانیؒ جلد اول) : ترجمہ و تعلیق : جناب شیخ محمد وجیہ الدین القاری المقری ، متوسط تقطیع ، کاغذ و طباعت بہترین ، مجلد ، صفحات : ۳۰۹ ، قیمت درج نہیں ، پتہ : انسٹی ٹیوٹ آف نقش بندی مجددی ورکس ، پی۔ بلاک ، مرغ زار کالونی ، ملتان روڈ ، لاہور۔

امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات شروع سے اہل فکر و نظر کے لیے سرمہ و سرمایہ بصیرت ہیں ، خواجہ باقی باللہ ، شیخ فرید بخاری ، عبدالرحیم خان خاناں اور دیگر امرا ، حکما ، علما اور طالبان علم کے نام ان مکتوبات میں تصوف کی اصلاح و تجدید اور اس راہ میں واردات و مشاہدات کی ایک دنیا آباد ہے ، خود امام صاحب کے حالات اور ان کی تجدیدی مساعی کا یہ مستند ماخذ ہیں اور اس ضمن میں ان کے عہد کی تمدنی ، معاشرتی ، اخلاقی اور سیاسی تاریخ کا بھی اہم مرجع ہیں ، مکتوبات کے افادی تنوع کا اندازہ مولانا سید سلیمان ندوی کے ایک خط بنام مولانا دریابادی سے ہوتا ہے کہ "یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ برکلے کی تھیوری حرف بہ حرف مجدد الف ثانی کے مکتوبات میں موجود ہے ، صرف اجمال و تفصیل کا فرق ہے" ، علامہ اقبال کے خطبات میں بھی افکار امام کی جھلکیاں ملتی ہیں ، ان مکتوبات کا ترجمہ اردو میں ہو چکا ہے ، اب زیر نظر کتاب کے مکتوبات کی پہلی جلد کے ۲۱۳ خطوط کو بڑے اہتمام سے انگریزی میں منتقل کیا گیا ہے ، شروع میں فاضل مترجم کے قلم سے عمدہ مقدمہ ہے جس میں حضرت مجدد کی شخصیت ، امتیاز اور خصایص کو جامع اختصار سے بیان کیا گیا ہے ، انگریزی داں قارئین کے لیے نقش بندی مجددی سلسلے اور صوفیانہ اصطلاحات کی تشریح بھی ہے ، جابہ جا مفید حواشی دیے گئے ہیں ، مثلاً پہلا ہی مکتوب جو اسم ظاہر کے مناسب احوال اور عروج توحید ، درجات

بہشت اور بعض اہل اللہ کے مراتب کے بیان میں ہے، اس کے حاشیے میں ایک نقشے کے ذریعے عالم خلق و امر اور دائرہ امکان کے مراتب کو ظاہر کیا گیا ہے، ترجمہ کی افادیت میں شبہ نہیں، البتہ مکتوب الیہم کے مختصر تعارف اور خود فاضل مترجم کے مختصر حالات کی تشنگی کا احساس ہوتا ہے، کتاب کی طباعت اور تزئین قابل رشک ہے۔

RESISTANCE AND MODERNIZATION UNDER HAIDER ALI & TIPU SULTAN: مرتبہ: جناب پروفیسر عرفان حبیب، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات: ۲۵۵، قیمت ۲۲۰ روپے، پتہ: تلیکا (Tulika) ۳۵ اے/۱، تھرڈ فلور، شاہ پور، نئی دہلی ۔۴۹۔

ہندوستان کی تاریخ میں ۴؍ مئی ۱۷۹۹ء اس لحاظ سے یوم سیاہ ہے کہ عین اسی روز برطانوی استعمار کے سامنے ہندوستان کا آخری قلعہ، سرنگاپٹم کی شکل میں مسمار ہوا تھا، ٹیپو سلطان کی شہادت سے ملک پر برطانوی قبضہ و تسلط کی راہ آسان ہوئی، لیکن زیر نظر کتاب کی مقدمہ نگار اور انڈین ہسٹری کانگریس کی سکریٹری محترمہ شیریں موسوی کے الفاظ میں یہ سانحہ کم افسوس ناک نہیں کہ دو سو سال گزرنے کے بعد ۱۹۹۹ء میں یہ دن قوم اور قائدین کی بے حسی کی نذر ہو گیا، ایک عظیم قربانی فراموش کر دی گئی، تاہم انڈین ہسٹری کانگریس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس داستان شجاعت و غیرت کو بھولی بسری داستان نہ بننے دے گی، اسی عزم کا ایک مظہر زیر نظر کتاب ہے، جس میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے متعلق کانگریس کے سالانہ ترجمان میں شایع ہونے والے مضامین اور دوسرے اور موقر علمی و تاریخی مجلوں کے منتخب مقالات کو یکجا کر کے پیش کیا گیا ہے، فاضل مرتب خود مشہور مورخ ہیں، ان کا نام حسن انتخاب اور سلیقۂ ترتیب کے لیے کافی ہے، چنانچہ ان دونوں حکمرانوں کے حالات، جنگ اور فتوحات، سیاسی بصیرت، بین الملل تعلقات، کار تجدید، فوجی ساز و سامان کی تیاری اور بحری بیڑے کی ترقی جیسے موضوعات پر نہایت پر از معلومات اور مفید مباحث سے ایک قیمتی اور وقیع تاریخی دستاویز تیار ہو گئی، فاضل مرتب کا بسیط مقدمہ بجائے خود ایک بہترین مقالہ ہے، جس میں انہوں نے اس مجموعہ کا عطر پیش کرنے کے ساتھ حقایق پر نظر کرنے کی راہ فراہم کر دی ہے، ان کا زاویہ نظر قطعی معروضی اور غیر جذباتی ہے، حیدر علی کی قوت و عزیمت کے

سرچشمے کی شناخت ہو یا ٹیپو سلطان کی مذہبی حمیت و غیرت کی فراوانی کی بات ہو، انہوں نے حقیقت کی ترجمانی ہی کی ہے کہ ہندوؤں کے جذبات اور ان کے مذہبی و سیاسی مفادات کے پاس و لحاظ میں ان دونوں حکمرانوں نے کبھی کوتاہی نہ برتی، رعایا کی رعایت و حفاظت اور ان کی خوش حالی و بہبودی ہی ان کے مد نظر رہی اور حسن نیت اور صدق عمل نے ان دونوں کو عام محبوبیت و مقبولیت عطا کی، ان دونوں بیدار مغز حکمرانوں نے جدید تکنیک کی اہمیت محسوس کی، حیدر علی کے اسلحہ خانوں کی بندوقیں، معیار میں کارخانہ یورپ کی ڈھلی بندوقوں سے کم نہ تھیں، ٹیپو سلطان اس معاملہ میں اپنے والد سے زیادہ متحرک و متفکر تھے، فاضل مرتب نے ایک طویل بحث کے بعد لکھا ہے کہ کیا اب بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ "ٹیپو سلطان ایسا مخترع بادشاہ تھا جس نے کوئی بہتری اور ترقی نہیں دکھائی یا جس کا مقصد اپنے ملک کی درستگی سے زیادہ صرف اپنی رعایا کو مرعوب کرنا تھا" اس عمدہ اور مفید کتاب کی اشاعت کے لیے انڈین ہسٹری کانگریس یقیناً داد و ستایش کی مستحق ہے۔

بیسویں صدی کی اردو شاعری: انتخاب و ترتیب: جناب اوصاف احمد، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات: ۷۷۸، قیمت ۳۰۰ روپے، پتہ: انجمن ترقی اردو ہند، اردو گھر، ۲۱۲۔ راؤز ایونیو، نئی دہلی ۔۲۔

بیسویں صدی کا اختتام ہوا تو مختلف میدانوں میں قرن گذشتہ کی کارگزاری، ناکامی اور جستجو و یافت کے حساب اور جائزے کی فکر ہوئی، زیر نظر کتاب بھی اسی مقصد سے مرتب کی گئی ہے کہ گذشتہ سو سال کی اردو شاعری کے بہ تدریج تغیر، ترقی یا تنزل کا ایک مستند آئینہ و پیمانہ فراہم ہو جائے، اردو شاعری کی وسعت، کثرت اور ثروت کے پیش نظر انتخاب کا یہ عمل آسان نہیں، خصوصاً فرد واحد کے لیے یہ مشکل بڑی سخت ہے، لیکن لایق مرتب سزاوار تحسین ہیں کہ انہوں نے یہ مرحلہ بہ خیر و خوبی سر کر لیا، ضخامت کی دشواری کی وجہ سے دائرۂ انتخاب صرف غزل اور نظم تک محدود رہا حالاں کہ مرتب کو یہ احساس تھا کہ اصولاً تمام اصناف سخن کی نمایندگی ہونا چاہیے، اس کمی کی تلافی، قریب ہر مکتب فکر کی شاعری کے انتخاب سے کی گئی، بعض شعرا غیر معروف اور کم درجے کے ہیں جب کہ شعری بھوپالی، سکندر علی وجد اور نشور واحدی جیسے شعرا اس ایوان میں بار نہ پا سکے لیکن یہ کسی بھی انتخابی عمل کا ناگزیر المیہ ہے، ابتدائی تحریروں میں مکتبۂ فکر اور منتخب شدہ

جیسی تعبیرات محل نظر ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی کی ادبی خدمات: از ڈاکٹر محمد طاہر، متوسط تقطیع، کاغذ وطباعت عمدہ، مجلد مع گرد پوش، صفحات: ۲۴۶، قیمت ۱۵۰ روپے، پتہ: ڈاکٹر محمد طاہر، شعبۂ اردو، شبلی نیشنل ڈگری کالج، اعظم گڑھ۔

اردو ادب میں مزاح نگاری کی صنف ہر دور میں قد آور ادیبوں کی وجہ سے سربلند رہی، عہد حاضر بھی کئی بلند پایہ مزاح نگاروں سے سرخ رُو ہے، ان میں مشتاق احمد یوسفی بھی ہیں جن کی ذہانت، نفسیات انسانی کے مطالعے کی صلاحیت، زبان پر قدرت، اسلوب کی جدت اور بلند ذوق ظرافت کا اعتراف عام ہے، ان کی کتابوں کی مقبولیت بھی قابل رشک ہے، اس کتاب میں لایق مصنف نے ان کے فن واسلوب کا بڑی محنت، دقت اور دیدہ ریزی سے مطالعہ کیا اور حسن یوسفی کی ساری تابانیوں کو سمیٹنے کی کوشش کی، اصلاً یہ مقالۂ تحقیق ہے، چنانچہ اولاً تو طنز ومزاح کی عمومی تاریخ اور پھر اردو مزاح نگاروں کا ایک جائزہ لیا گیا، بعد کے ابواب میں مشتاق یوسفی کی کتابوں اور ان کے فن کے قریب ہر پہلو کا تجزیہ کیا گیا ہے، اردو کے چند ممتاز مزاح نگاروں سے ان کا موازنہ بھی ہے، لایق مصنف کی نظر میں یوسفی کا اسلوب اور فن اس درجہ ممتاز ومنفرد ہے کہ ان کے اسلوب پر کسی اور کے اثر کی تلاش بھی کارعبث ہے اور یہ کہ یوسفی کا فن رشید احمد صدیقی سے ارفع واعلیٰ ہے، علمی تجزیوں میں ایسے قول فیصل مناسب نہیں، اردو مزاح نگاروں میں تخلص بھوپالی کا نام رہ گیا، انہوں نے اردو مزاح کو چند یادگار کردار عطا کیے ہیں، اس اچھی کتاب میں کتابت کی غلطیاں بہت ہیں۔

تعلیمی تجزیے: از ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات: ۱۰۸، قیمت ۱۰۰ روپے، پتہ: عدیلہ پبلی کیشنز، ڈومن پورہ (کساری)، مئوناتھ بھنجن یوپی اور مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی وممبئی۔

اس کتاب کے لایق مصنف تعلیم وتدریس کے پیشے سے وابستہ ہیں لیکن یہ وابستگی محض پیشہ ورانہ نہیں بلکہ ان کو یہ احساس ہے کہ تعلیم اصلاً کارپیمبرانہ ہے اور مقصد اس کا مردم سازی ہے اور یہ فہم وفراست کے ساتھ دل سوزی وجگر کاوی کا بھی متقاضی ہے، ان سے یہ سچائی بھی چھپی

نہیں کہ موجودہ نظام تعلیم، نئی نسل کی صحیح رہنمائی سے قاصر ہے، وہ وقتاً فوقتاً اپنے جذبات کا اظہار قلم کے ذریعہ کرتے رہے، اس کتاب میں ایسی کئی تحریروں کو یکجا کردیا گیا ہے، تعلیم، امتحان، بدلتی قدریں، بنیادی اور ثانوی اور اعلیٰ تعلیم، حصول تعلیم کے لیے بڑھتے مصارف اور صنف نازک جیسے موضوعات پر ان تحریروں میں تجربہ اور فکر کی آمیزش نے افادیت پیدا کردی ہے، اردو اور مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کے متعلق فکر اور دردمندی نمایاں ہے، تعلیمی مسایل سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب مفید ثابت ہوسکتی ہے۔

سلام وپیام (جلد اول): مرتب جناب امین بنجارا، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات: ۲۷۰، قیمت ۲۰۰ روپے، پتہ: انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر، ۲۱۲، راؤز ایونیو، نئی دہلی اور مکتبہ جامعہ، دہلی۔

جناب جگن ناتھ آزاد کی کتابوں اور خود ان کی شخصیت سے متعلق کتابوں کا ایک سلسلہ، زندہ رود کی مانند رواں دواں ہے، ان کی پوری زندگی علم وفن اور اصحاب فن سے تعلق اور وابستگی سے عبارت ہے، زیر نظر کتاب کا تعلق اسی گوشے سے ہے جس میں سینکڑوں معاصرین کی تحریری ملاقاتیں خطوط کی شکل میں یکجا کی گئی ہیں، قدرتاً اس قوس قزح میں سب سے نمایاں رنگ اقبالیات کا ہے، اکثر خطوط میں اسی حوالے سے گفتگو ہوئی ہے اور بے ساختگی میں بعض خطوط میں دل کی باتیں اس طرح نوک قلم پر آگئی ہیں کہ احتیاط اور مصلحت کے حجابات اٹھ کر رہ گئے، لیکن خطوط کی بڑی تعداد نجی معاملات سے متعلق ہے جن میں دوسروں کے لیے دل چسپی کا سامان کم ہے، ایسے خطوں کو نظر انداز کرنا ہی بہتر تھا، لایق مرتب نے حواشی کا اہتمام بھی کیا ہے لیکن کہیں کہیں تشنگی کا احساس ہوتا ہے، مثلاً مالک رام کے ایک خط میں ہے کہ "وہ مولانا دریابادی والے معاملہ کا کیا ہوا؟" یہاں وضاحت ضروری تھی، عبدالقوی دسنوی کے متعلق یہ لکھنا درست نہیں کہ وہ برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال کے شعبہ اردو کے صدر رہ چکے ہیں، اسی طرح وارث ریاضی کو علی گڑھ کے شعبہ فارسی کا وظیفہ یاب صدر لکھنا بھی درست نہیں۔

سلسبیل: از جناب تابش مہدی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع خوبصورت گرد پوش صفحات: ۱۱۲، قیمت ۶۰ روپے، پتہ: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو،

جامعہ نگر، نئی دہلی۔

اس خوبصورت اور پاکیزہ نعتیہ مجموعے کے شاعر، بامقصد اور پراثر سخن گوئی کے لیے معروف ہیں، نعت گوئی ان کی شاعری کا اصل محور ہے، ان کے نزدیک یہ دماغ سے زیادہ دل کا معاملہ ہے، سرور کائنات علیہ السلام سے محبت وعقیدت کے والہانہ اظہار میں حد ادب کا پاس ولحاظ اور غلو اور بے اعتدالی کا خیال ضروری ہے، خوشی ہے کہ شاعر نے اس نزاکت کو ملحوظ رکھا ہے اور شاید اسی لیے ان کے ہر شعر میں ایک کیفیت ہے، نعتوں کے علاوہ حمد اور متعدد منقبتیں بھی ہیں اور یہ سب غزل کے پیرایے میں ہیں۔

میرے حصے کی دھوپ: از جناب نوشاد علی سید، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات: ۱۲۸، قیمت ۱۵۰ روپے، پتہ: علی سنز پبلی کیشنز، جامعہ نگر، اوکھلا، دہلی۔

یہ خوبصورت مجموعۂ کلام بہ ظاہر ایک کم نام شاعر کے جذبات واحساسات کا آئینہ ہے لیکن تخیل اور اس کو لفظی پیکر عطا کرنے کی صلاحیت ہر شعر سے نمایاں ہے، وہ نئی نسل کے شاعر ہیں، ہندوستان کے موجودہ حالات کا کرب ان کے اشعار میں خاص طور پر محسوس ہوتا ہے، آگ اور دھوپ جیسے الفاظ، شعوری طور پر ان کے اظہار کی داستان سناتے ہیں، غزل کے سانچے میں انہوں نے موجودہ سیاسی بے چینی کو بڑی کامیابی سے ڈھال دیا ہے، یہ اشعار دراصل ان کی آپ بیتی ہیں۔

یہ کائنات اندھیرے میں غرق رہ جاتی　　اگر نہ صدقہ ملا ہوتا نور کا تیرا

جیسے حمد یہ شعر سے شاعر کی سلامت فکر بھی متعین ہو جاتی ہے۔

المبتدا (حصہ اول و دوم): از جناب عطاء اللہ خاں امینی، متوسط تقطیع، کاغذ وطباعت عمدہ، قیمت بالترتیب ۳۰ و ۳۲ روپے، پتہ: مکتبہ مہر، ۱۳۵۶، شیخ۔ کالونی رسول آباد، کھاڑی پار بھیونڈی، مہاراشٹر۔

درجہ چہارم و پنجم کے طلبہ کے لیے عقیدہ واخلاق، سیرت طیبہ اور عربی زبان کے اسباق پر مشتمل یہ درسی کتاب آسان زبان میں ضروری معلومات اور مشق کے لیے مرتب کی گئی ہے، تعلیمی نصاب میں یہ مفید ثابت ہو سکتی ہے۔

ع۔ ص